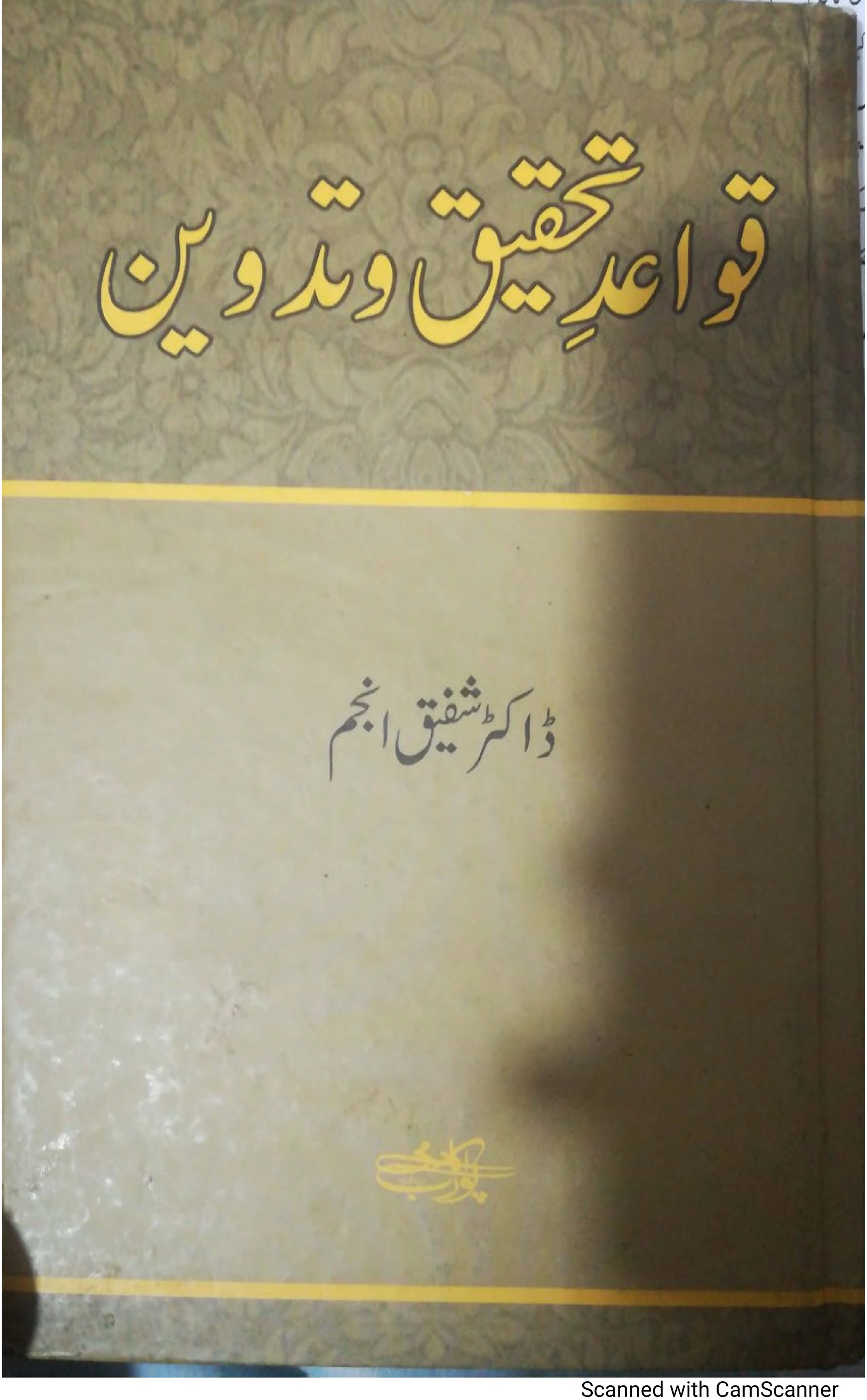

قواعدِ تحقیق و تدوین

ڈاکٹر شفیق انجم

پورب اکادمی

السلامُ علیکم

گروپ میں شمولیت کے
لیے رابطہ نمبر :عبداللہ
عتیق
03478848884

"اللہ" کی عطاؤں پر "الحمد اللہ" اور اپنی خطاؤں پر "استغفر اللہ
کہنا "اللہ" کو بہت پسند ہے۔

"اللہ" آپکو تا حیات تندرست، سلامت اور شادو آباد رکھے۔

آمین

قواعدِ تحقیق و تدوین

ڈاکٹر شفیق انجم

پورب اکادمی، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

طبع اوّل: جولائی 2015ء
ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد
فون نمبر: 051 - 231 7092
ای میل: poorab_academy@yahoo.com

Qawaid e Tehqiq o Tadween

by: Dr. Shafique Anjum

Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

انتساب

پیارے بچوں۔۔

محمد موسٰی

اور

ایمن زہرہ

کے نام

ع غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

فہرست

دیباچہ ڈاکٹر رشید امجد ۷
پیش لفظ ڈاکٹر شفیق انجم ۹

اردو ادبی تحقیق: چند سوال اور تفہیمی زاویے ۹

سندی تحقیق کی بنیادی شناختیں اور مراحل ۲۰
تحقیقی مقالے کی تشکیل کا اولین قدم: خاکہ سازی ۳۲
عنوان سازی کے قواعد اور طریقے ۴۵
تحقیقی مقالے کی زبان اور اسلوبیاتی شناختیں ۵۶
ماخذ کے اندراج کے قواعد اور طریقے ۶۶

تدوینِ متن: مراحل، مسائل اور تجاویز ۸۶
قدیم متون میں علامات ورموزِ تحریر کی قرأت ۱۰۴

دیباچہ

(ڈاکٹر رشید امجد)

ڈاکٹر شفیق انجم افسانہ نگار، نقاد اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی یہ تازہ کاوش تحقیق کے حوالے سے ہے۔ جب سے ہماری جامعات میں تحقیقی مقالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور روز بروز ہو رہا ہے، ایسی کتابوں کی ضرورت بھی بڑھ رہی ہے۔ چند برس پہلے تک اس موضوع پر گنتی کی کتابیں موجود تھیں لیکن ادھر کچھ عرصے سے مارکیٹ کی ضرورتوں کا اندازہ کرتے ہوئے بہت سی کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کتابوں کی صحت کے حوالے سے سوال اٹھتے رہتے ہیں۔

تحقیق کی ایک صورت تو وہ ہے جہاں محقق اپنی ذاتی دلچسپی یا کسی ادارے کے لیے تحقیقی کام کرتا ہے۔ اب یہ صورت بہت محدود ہو گئی ہے کہ تحقیق وہ فن ہے جس میں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ مالی وسائل بھی اہم ہیں، جو اکثر صورتوں میں میسر نہیں ہوتے۔ اس لیے انفرادی تحقیق کی تعداد ہمیشہ کی طرح آج بھی محدود ہے۔ البتہ ملازمتی ضرورتوں کے تحت اب جامعات میں تحقیقی مقالے لکھنے کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے معیار کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ پہلے یہ کام شوق سے ہوتا تھا، اب تنخواہ میں اضافے کے ہونے لگا ہے۔ کوئی اہل ہے یا نہیں الاؤنس کے لالچ میں ایم فل، پی ایچ ڈی کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں لیکن بڑھتی ہوئی تعداد معیار کو ضرور متاثر کر رہی ہے۔

معیار بندی کے اس معاملے میں جہاں اساتذہ ذمے دار ہیں وہاں اچھی اور معیاری کتابوں کی عدم دستیابی بھی وجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض تحقیقی طریقہ ہائے کار پر اختلافات بھی ہیں، خصوصاً حوالہ جات، اشاریہ سازی اور مقالے کی پیشکش کے حوالے سے متضاد آرا کی موجودگی کی وجہ سے جامعاتی محقق کو کئی الجھنوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کی یہ کتاب ''قواعدِ تحقیق و تدوین'' اگرچہ ضخامت کے حوالے سے چھوٹی لیکن مواد کی صحت کے حوالے سے بڑی کتاب ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے اردو ادبی تحقیق کے حوالے سے بنیادی موضوع کا تعین و تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ دوسرے حصے کے پانچ مضامین تحقیقی مقالے کی بنیادی شناخت، خاکہ سازی، عنوان سازی، تحقیقی مقالے کی زبان و اسلوب اور مآخذ کے اندراج سے متعلق ہیں۔ کسی بھی جامعاتی تحقیقی مقالے کے یہ وہ بنیادی مراحل ہیں جن کی صحت کا خیال رکھے بغیر، موضوع کتنا بھی اہم اور منفرد ہو، اچھا مقالہ تحریر نہیں ہوسکتا۔ تیسرا حصہ متن اور تدوینِ متن سے متعلق ہے جو اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کی اس کتاب کی خوبی اس کا سادہ اور دلچسپ اسلوب اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اپنے تجربے اور غور فکر سے کئی اہم امور پر دوٹوک اظہار کیا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں واضح ہیں۔ ادق تحقیقی اصطلاحوں کے بجائے انھوں نے سادہ اور صاف انداز اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب عالموں کے لیے نہیں طالبعلموں کے لیے ہے اور بہت ہی مفید۔ جامعاتی مقالہ لکھنے والے ہر سکالر کے لیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید اور ضروری ہے۔

پیش لفظ

اردو تحقیق و تدوین کے حوالے سے میرا یہ کام تین زمروں میں ہے۔ پہلے زمرے میں اردو ادبی تحقیق کے حوالے سے کچھ مسائل نشان زد کر کے ان کے پس منظر اور نوعیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اردو ادبی تحقیق کی قدیم و موجودہ صورتحال، خصائص، نقائص اور امکانات پر مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔ یہ گفتگو ''اردو ادبی تحقیق: چند سوال اور تفہیمی زاویے'' کے عنوان سے کتاب کا حصہ ہے۔ یہاں چونکہ کچھ تلخ حقائق کی بات بھی ہے اس لیے کہیں کہیں بیانیہ اور لہجہ درشت ہو گیا ہے۔ تاہم اطمینان ہے کہ جن اساتذہ کا میں پیروکار ہوں، ان کا لہجہ ان معاملات میں صرف درشت نہیں، جارحانہ ہوتا ہے۔ ان کے بیانات کو حواشی میں بطور نمونہ پیش کر دیا ہے تا کہ تشفی رہے۔ امید ہے سیاق و سباق کی مناسبت سے مذکورہ اندراجات کو گوارا کیا جائے گا۔

دوسرا زمرہ سندی تحقیق کے مراحل، مسائل اور وظائف پر مبنی ہے۔ یہاں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے امور کو فوکس کیا جائے جن پر قبل ازیں کم لکھا گیا یا لکھا ہی نہیں گیا۔ اس زمرے میں پہلے موجود مواد کو نشان زد کرتے ہوئے گنجائش، ضرورت اور اپنی محدود توفیق کے مطابق کچھ نیا مواد پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ معاون مواد کو حواشی میں جگہ دی ہے تا کہ بیانیہ بھرتی کا شکار نہ ہو اور بنیادی نکات مختصر اور واضح رہیں۔ سندی تحقیق کی منفرد شناختوں کو اجاگر کرتے ہوئے کچھ ایسے معاملات کو بطور خاص تحریر میں لایا گیا ہے جن کا جاننا اسکالرز کے لیے مفید ہے۔ تحقیقی ڈیزائین اور خاکہ سازی، عنوان سازی، تحقیق کے اسلوب

اور ماخذات کی پیشکش کے حوالے سے اندراجات بھی اس زمرے کا حصہ ہیں۔

اس کام کا تیسرا زمرہ تدوین متن کی بابت ہے۔ تدوین پر اگرچہ کئی وقیع کتب اور مقالات موجود ہیں لیکن میں نے اس ضمن میں اپنی گزارشات پیش کرنے کے لیے گنجائش کو ملحوظ رکھا ہے۔ تکرار سے بچتے ہوئے اختصار کے ساتھ تدوین متن کے مراحل و مسائل کو یہاں فوکس کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مختلف تدوینی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ اسی زمرے میں ایک مقالہ قدیم متون میں علامات و رموزِ تحریر کی قرأت کے حوالے سے بھی ہے جس میں سنین و ارقام کی مختلف صورتوں اور قرأتِ متن کی چند خصوصی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی میرا یہ کام اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے اپنے زمانۂ طالبعلمی میں دیکھا۔ کئی برس پہلے ایم اے اردو کی کلاس میں استادِ گرامی ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے اصول تحقیق و تدوین پڑھتے ہوئے ارادہ کیا تھا کہ اس موضوع پر ایک کتاب میں بھی لکھوں گا۔ بعد میں اگرچہ جوش و جذبے میں کچھ کمی آ گئی لیکن خواب مرتے نہیں۔۔۔ پس کچھ عرصہ پہلے ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا اور آہستہ آہستہ ہدف کی جانب بڑھتا رہا۔ یقیناً بہت محنت طلب کام تھا اور اگر اسے تعلیٰ پر محمول نہ کیا جائے تو کہنا چاہتا ہوں کہ خوب پسینہ بہایا ہے۔ مسرور ہوں کہ خواب کی تعبیر ملی۔ لکھنے کو بہت کچھ تھا لیکن میں نے صرف انھی موضوعات کو چنا ہے جن کے بارے میں تشنگی محسوس ہوئی۔ بحث کی طوالت کو گرفت میں رکھنے کی بھی شعوری کوشش کی ہے اور اسکالرز کا افادہ ہر سطح پر پیشِ نظر رہا ہے۔ امید ہے انھی حدود کے ساتھ کتاب کے اندراجات کو جانچا جائے گا۔ خدائے بزرگ و برتر سے اپنی توفیقات میں اضافے کا خواستگار ہوں۔

تحریر: ۱۳ جون ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر شفیق انجم

شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اردو ادبی تحقیق: چند سوال اور تفہیمی زاویے

تحقیق کیا ہے؟ عام طور پر اس سوال کا جواب دریافت، کھوج، تلاش وغیرہ جیسے استعاروں کی مدد سے دیا جاتا ہے جو دلالت کرتے ہیں ہیں ایک خاص سرگرمی اور عمل کی ایک خاص حالت پر۔ تحقیق کے مطلق تصور کی حد تک تو یہ درست ہے لیکن جب کسی خاص شعبے میں تحقیق کے معنی و مفہوم کو جاننا مقصود ہو تو ان استعاروں سے آگے مزید کچھ نشانات کی ضرورت پڑتی ہے جن کا انحصار اس خاص شعبے اور اس شعبے سے متعلق کچھ خاص زاویوں پر ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر تحقیق کے مطلق تصور میں تو اتنی گنجائش ہے کہ اس کے تحت ہر انسانی سرگرمی اور عمل کو تحقیق قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔ یہ نکتہ مقالے کے آغاز میں اس لیے کہ فی زمانہ علوم کی تازہ گروہ بندی کے جنوں میں مختلف شعبہ جات کی بنیادی شناختوں کو ملحوظ رکھے بغیر، محض خروش علمی میں کچھ نئی لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں اور نتیجتاً خصوصیت، عمومیت کے زیرِ عتاب آ جاتی ہے۔ مخصوص، معین شناختوں کے حامل شعبہ جات کو نئی گروہ بندی کے تحت کچھ ایسے زاویوں سے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے بے تفہیمی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دنیا کی مختلف زبانوں، ثقافتوں اور فنون کا بکھراؤ اور بعض صورتوں میں مکمل تباہی اسی صورتحال کی دین ہے۔۔۔ اردو ادبی تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو نئے علومی تغیرات نے یہاں بھی کچھ ایسے سوال اٹھا دیے ہیں جن کا قبل ازیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ سوال کیا ہیں، کیوں اٹھائے جا رہے ہیں اور ان کا مناسب جواب کیا ہو سکتا ہے؟ زیرِ نظر تحریر انھی امور سے متعلق ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اختلافِ رائے ذاتی نہ ہونے

پائے اور وضاحتیں دلائل کے تابع رہیں۔

اردو ادبی تحقیق کے رائج عمومی مفاہیم کو دیکھا جائے تو وہ کچھ یوں ہیں کہ تحقیق سچ اور حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ (۱) تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ (۲) تحقیق ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں، موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ (۳) تحقیق کسی مسئلے کے قابل اعتماد حل اور صحیح نتائج تک پہنچنے کا وہ عمل ہے، جس میں ایک منظّم طریق کار، حقائق کی تلاش، تجزیہ اور تفصیل کاری کی پوشیدہ ہوتی ہے۔ (۴) تحقیق صداقت یا سچائی کی تلاش کا نام ہے اور اس صداقت تک محققین منطقی اور معروضی عمل کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ (۵) تحقیق کا مقصد نامعلوم حقائق کی تلاش اور معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ (۶) تحقیق کا مطمح نظر حقیقت کی جستجو اور واقعے کی صداقت کی تلاش ہے۔ (۷)

ان تعریفوں پر غور کیا جائے تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ تحقیق تلاش اور دریافت کا نام ہے۔
۲۔ تحقیق کسی امر، سچ، صداقت، حقیقت یا حقائق کو دریافت کرتی ہے۔
۳۔ تحقیق معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح کرتی ہے
۴۔ تحقیق کا کام کسی امر کو اس کی اصلی صورت میں بحال کرنا ہے۔
۵۔ تلاش اور دریافت کے لیے ایک طریقۂ کار ضروری ہے۔
۶۔ یہ طریقۂ کار معروضی و منطقی ہونا چاہیے۔

ان نکات کے حوالے سے کچھ سوال خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً یہ کہ: اردو ادبی تحقیق کے لیے یہ مفاہیم کیسے تشکیل پائے؟ ان کا علمی و ثقافتی پس منظر کیا ہے؟ کیا یہ مفاہیم مناسب و مکمل ہیں؟ اگر نہیں تو نقائص و معائب کیا ہیں؟ کیا یہ موجودہ دور کی علمی و فکری ترقی سے مطابقت رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا انھیں بدلنا ممکن ہے؟ اگر ہے تو کیا تبدیلی ہونی

چاہیے؟ وغیرہ۔۔۔ ان سوالوں پر سنجیدگی سے غور اردو ادبی تحقیق کے اختصاصی زاویوں کو سامنے لانے میں بھی مدد فراہم کرتا ہے اور ان تازہ گردشی سوالوں کی نوعیت بھی پتہ چلتی ہے جو تازہ علمی تسلسل کے باعث بعض اردو اہل قلم کی جانب سے اٹھائے گئے ہیں۔ ذیل کی گزارشات اسی ضمن میں ہیں:

اردو ادبی تحقیق کے لیے ان مفاہیم کے تشکیل کے عمل کو دیکھا جائے تو اس کے آثار انیسویں صدی کے ربع آخر سے ملنا شروع ہوتے ہیں جب شبلی، حالی اور آزاد مسلم تہذیب و ثقافت کے احیاء کو مقصود مان کر اس سے متعلق آثار کو محفوظ کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہاں نظریہ سازی کی کوئی کوشش نہیں ملتی تاہم تحقیقات کا غالب سرمایہ مشرقی روایات اور مسلم تشخص سے تعلق رکھتا ہے۔ حقائق کی تلاش و جستجو ہدف ہے اور طریقۂ کار کی سطح پر معیار، عربی تصورِ روایت و درایت ہے۔ شبلی نعمانی کی 'سیرت النبی' میں ان تینوں پہلوؤں کو بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کا نصف اول اردو تحقیق کے اثبات اور نصف آخر ترقی و استحکام کا زمانہ ہے۔ نصف اول میں اردو تحقیق سے وابستہ زیادہ تر اصحاب عربی کے عالم اور ان تحقیقی اصولوں سے پورے طور پر واقف تھے جو قرآن، حدیث اور سیرت کی تحقیق، ترتیب اور تدوین میں عربوں نے روا رکھے۔ سو فطری طور پر انھوں نے اسی روایت سے استفادہ کیا اور کئی اعلیٰ تحقیقی نمونے پیش کیے۔ بعد میں جب تحقیق کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کے لیے نظری بنیادیں اور عملی طریقۂ کار وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو عربی روایاتِ تحقیق ہی کو بطور معیار موزوں سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اصول تحقیق کی متعدد کتب بعض علماء (عربی زبان و ادب کے ماہر اساتذہ) ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ عملی تحقیق کے نمونوں کو دیکھا جائے تو آغاز سے دور حاضر تک اردو تحقیق، عربی کے زیر بار ہے۔ محض رہنما اصولوں، انتخاب و اختلاف، طریقۂ کار، اخلاقیات اور اہداف و حاصلات کی سطح پر ہی نہیں الفاظ و اصطلاحات اور ان کے مفاہیم و استعمالات کی سطح پر بھی عربی روایاتِ تحقیق کے

اثرات شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اردو تحقیق کے مذکورہ مفاہیم (اصول) مناسب و مکمل ہیں اور کیا انھوں نے ہمارے علمی و فکری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کیا ہے یا نہیں تو اس کا جواب براہ راست ہاں یا نہیں میں دینا ممکن نہیں۔ موزوں یہی ہے کہ دیکھا جائے کہ ان اصولوں کے تحت کس قسم کی تحقیق وجود میں آئی اور اس کی خوبیاں خامیاں کیا ہیں۔ دستیاب مواد کی بنیاد پر غور کیا جائے تو اردو تحقیق آغاز ہی سے اس رہنما اصول کے تابع ہے کہ سچائی اور حقیقت اپنی اصلی صورت میں کہیں نہ کہیں موجود ہے، تحقیقی عمل کے ذریعے اس کی بازیافت کی جانی چاہیے۔ نامعلوم حقائق کی بازیافت، معلوم حقائق کی تصحیح و تصدیق اور اصل کی بحالی تحقیق کا بنیادی وظیفہ ہے۔ مخصوص مذہبی و ثقافتی پس منظر میں یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ اردو، اس کا ادب اور تاریخ، عربی و فارسی سے مستعار ہے چنانچہ حقائق کی تلاش و تصحیح میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے۔ غالباً اسی فکر کے بدولت اردو تحقیق کا جھکاؤ ابتدا ہی سے کلاسیکی ادب، ادوار اور اصناف کی طرف زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر اردو ادبی تحقیق کے سرمائے کو دو واضح حصوں: ۱۔ موضوعی و سوانحی، ۲۔ تدوینی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ محققین نے کوشش کی کہ تاریخ ادب کے نامعلوم گوشوں تک رسائی حاصل کی جائے، معلوم گوشوں کی تصحیح کی جائے اور ادبی متون کو درست اور اصلی حالت میں بحال کیا جائے۔ اس ضمن میں بجا طور پر انھیں کامیابی بھی ملی اور تاریخ ادب کے بہت سے تاریک و گمنام گوشے منور ہوئے۔ اردو کے قدیم متون کی دریافت، ترتیب، تصحیح اور تدوین کی ایک درخشاں روایت اس تحقیقی تسلسل کی دین ہے۔ مصنفین کے سوانحی کوائف کی فراہمی اور تواریخ و سنین کی درستی؛ ادبی امور سے متعلق مآخذ کی کھوج اور ان کی معیار بندی؛ اردو زبان کے ارتقائی نشانات کی بازیافت؛ مختلف ادوار، اصناف، اور رجحانات کی پہچان و شیرازہ بندی؛ اردو سے متعلق غیر ادبی متون و مآخذ کی تلاش و تدوین؛ اردو ادب کے تناظر میں تہذیبی و ثقافتی شواہد کی تفہیم نو؛ تراجم،

تشریحات، فہرست سازی، اشاریے اور وضاحتی کتابیات وغیرہ۔۔۔ یہ سب اردو ادبی تحقیق کی روایت کے بنیادی شناختی نشانات ہیں۔ ان تحقیقی کارناموں کی بابت ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا بجا ہے کہ: ''نہ صرف مقدار کے اعتبار سے بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی قابل تحسین ہیں۔ ان تحقیقات نے اردو تحقیق کے راستے کو کشادہ اور صاف کیا ہے اور اردو تحقیق نئے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھی ہے۔''(۸) اردو ادبی تحقیق کی روایت اور مختلف زمروں میں تحقیقی کاموں کی نوعیت کے حوالے سے مزید تفصیل ''اردو تحقیق: صورتحال اور تقاضے'' از ڈاکٹر معین الدین عقیل، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

محققین کی ان گرانقدر تحقیقی کاوشوں کی اہمیت و افادیت میں کلام نہیں تاہم یہ اعتراض ضرور ملتا ہے کہ یہ سب کچھ محض تجربے کی اٹکل سے بن بنا گیا، حقیقتاً یہاں کوئی سائنٹیفک بنیاد ہے نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے لفظوں میں:

> ''ہمارے بیشتر نئے پرانے محققین محض تجربے کی اٹکل سے عمر بھر کام کرتے رہتے ہیں لیکن تحقیق کے سائنٹیفک اصولوں سے وہ ناواقف رہتے ہیں۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے بیشتر محققین یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کن اصولوں کے مطابق کام کرتے رہے ہیں حالانکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جدید دور کی تحقیق میں اولیت تحقیق کے رہنما اصولوں کو دی جاتی ہے۔''(۹)

یہاں قابل غور نکات تجربے کی اٹکل اور تحقیق کے سائنٹیفک اصول ہیں۔ اول الذکر سے مراد قدیم اور روایتی طریقۂ تحقیق ہیں جن کا اصل الاصول صداقت کی حقیقی صورت میں بحالی ہے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے تجربے کی اٹکل ہی کافی ہے۔ سائنٹیفک اصولوں کی ضرورت تو اس وقت پڑتی ہے جب کوئی سائنٹیفک سوال درپیش ہو۔ اور اسے ایک خاص

زاویے سے قابلِ فہم بنانا مقصود ہو۔ اردو تحقیق کی روایت میں اس طرح کے سوالات نہیں ملتے بلکہ ایسے سوال ملتے ہیں جن کے جواب حقائق کی تلاش، جمع آوری، ان کی تصدیق و تصحیح اور ترتیب و تدوین کے ذریعے دیے جاسکتے ہیں۔ اردو محققین نے اس مخصوص رینج میں بہت اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں اور ان خدمات کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ اعتراض بھی سر اٹھاتا رہا ہے اور فی زمانہ اس کی بازگشت زیادہ سنائی دیتی ہے کہ کیا محض حقائق کی بازیافت ہی تحقیق کا مقصود و محور ہے اور کیا اس کے بعد تحقیق کا کام ختم ہو جاتا ہے؟ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے الفاظ دیکھیے:

> ''اردو تحقیق اب تک ان محققین کے ہاتھ میں رہی ہے جو حقائق کی تحقیق (Factual Research) پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز یہی حقائق اور واقعات ہیں۔ ان کی تمام عمر حقائق کی تلاش میں بسر ہوگئی ہے۔ یہ بات اس حد تک درست تھی کہ اردو ادب کے بارے میں صحیح حقائق اور واقعات منظرِ عام پر لانے کی ضرورت تھی اور ہمارے محققین نے اس بنیادی ضرورت کو پورا بھی کیا۔ اس عمل سے صحیح واقعات اور حقائق سامنے آئے۔ مگر کیا تحقیق صرف حقائق کی بازیافت تک محدود ہے؟ کیا بازیافت کے بعد تحقیق کا کردار ختم ہو جاتا ہے؟'' (۱۰)

اردو تحقیق کی چند عمومی مثالوں کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو واضح جواب یہی ہے کہ جی ہاں، اس کے بعد تحقیق کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیق کا فریضہ یہ نہیں کہ وہ توجیہہ و تعبیر کی طرف بڑھے کیونکہ یہاں سے تنقید کی زمین شروع ہو جاتی ہے۔ تحقیق شواہد کی بنیاد پر سچائی کو دریافت کرتی ہے اور تنقید اندازے / قرینے سے۔ محقق کا کام اندازے لگانا نہیں ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر نتائج مرتب کرنا ہے۔ یہ رویہ ہماری تحقیق میں بعض حلقوں کی جانب سے بہ اصرار نظر آتا ہے اور شاید اسی وجہ سے اہلِ تحقیق کو 'گورکن' کہہ کر طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اور محققین اہل نقد کو 'طوطے' کہہ کر اپنا غصہ اتارتے ہیں۔۔۔ تاہم یہ رویے اور مزاج کی ایک سطح ہے۔ دوسری سطح یہ بھی ہے کہ تحقیق اور تحقیقی عمل میں تنقید کا عمل دخل ناگزیر ہے اور تحقیق، حقائق کی بازیافت میں، تنقیدی شعور سے استفادہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تحقیق کے موجود رہنما اصول اس استفادے و امتزاج کی راہ میں حائل نہیں بلکہ معاون ہیں اور بیشتر علمائے ادب نے اس عمل کو مستحسن خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> بعض علمائے ادب نے ادب اور تحقیق کو دو مختلف عمل اور دو متوازی رویوں سے متصف کیا ہے لیکن اکثر علمائے ادب ان دونوں کے درمیان ایک ناگزیر تعلق اور رشتے کو لازمی قرار دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ تحقیق اپنے نتائج کی جستجو میں تنقیدی رویے اور اسلوب کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اسے ہر مقام پر واقعات، شواہد، مآخذ اور اخذِ نتائج کو جانچنا، پرکھنا اور تنقیدی عمل سے دوچار رہتے ہوئے دلائل اور امکانات اور قرائن و قیاس کی وادیوں سے گزر کر اپنی ممکنہ منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس طرح اس عمل میں تحقیق کے لیے تنقید پر انحصار واقعتاً لازمی ہو جاتا ہے۔" (۱۱)

تحقیق و تنقید کے باہمی ربط و تعلق اور اختلافات و امتیازات پر اصول تحقیق کی کتب میں بالصراحت اندراجات ملتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دونوں علوم ایک دوسرے کے لیے اہم ہیں مگر دونوں کی جداگانہ حیثیات بھی ہیں جن کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے۔ اردو ادبی تحقیق کی روایت میں جہاں اس ربط و تعلق سے انحراف کی مثالیں موجود ہیں وہاں انجذاب و امتزاج کی عمدہ صورتوں کی بھی کمی نہیں۔ پس ضروری ہے کہ اردو تحقیق کی بابت کوئی رائے قائم کرتے وقت دونوں صورتوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ (۱۲)

اردو ادبی تحقیق کی روایت کے بارے میں اس بیانیے سے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ تحقیق کے مروج رہنما اصولوں کے تحت کس قسم کی تحقیق ہوئی اور اس کی رینج کیا

ہے۔ اردو میں اگر اسی رینج کی تحقیق مقصود تھی اور ہے تو کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ ذرا سی اعتدال پسندی سے جزوی اعتراضات و اختلافات کو دور کیا جاسکتا ہے۔ مروج ادبی رہنما اصولوں اور ان کے تحت کی جانے والی تحقیق نے نہ صرف ہماری علمی وفکری ضرورتوں کو پورا کیا بلکہ ان کو مہمیز بھی لگائی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا۔ اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ آج اردو زبان وادب اور اس سے متعلق امور کی بابت جو علمی سرمایہ دستیاب ہے، وہ اسی تحقیقی تسلسل کی دین ہے۔ کہیں کہیں کجی اور تساہل کے آثار بھی ملتے ہیں اور فی زمانہ کاہلی اور تن آسانی کے رجحان کی بدولت اس میں شدت بھی نظر آتی ہے لیکن پتہ پانی کر دینے والی کاوشیں بھی بہت ہیں۔ یہاں یہ کہنا کہ سارے کا سارا کام طے شدہ منضبط اصولوں کے تحت ہوا، جانبداری ہوگی لیکن یہ کہنا بھی بجا نہیں کہ سب کچھ محض تجربے کی اٹکل سے وجود میں آگیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے مجموعی حالات کو پیش نظر رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو علمی وفکری تباہی کے تانوں بانوں کو دیکھا جائے تو بظاہر عیب دار نظر آنے والا یہ تسلسل بھی غنیمت لگتا ہے۔ ابتدا کی صورت حال اور بعد کے منظر نامے سے یہ بات عیاں ہے کہ اردو تحقیق نے بتدریج اپنے معیار کو بہتر بنایا ہے۔ تحقیقی اصولوں کی تدوین اور تحقیق میں خود محققین کی جانب سے احتسابی عمل کی گھن گرج اس بات کی دلیل ہے کہ بہتر سے بہترین کی طرف سفر جاری رہا ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادبی تحقیق اپنے رہنما اصولوں، اپنے طریقہ کار اور اپنی سمت ورفتار کے اعتبار سے ثروت مند ہے۔ اس میں دوسرے علوم سے ربط وتعلق پیدا کرنے کی لچک بھی موجود ہے اور خود اپنے وجود اور شناختوں کو برقرار رکھنے کی بھرپور قوت بھی۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ناگزیر ہے کہ اردو ادبی تحقیق کے مروج مفاہیم، دائرہ کار اور سمت ورفتار کے حوالے سے عدم اطمینان کی کیفیت بھی موجود ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے بہ تکرار اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ اردو تحقیق کی مروج صورتحال غیر تسلی بخش

ہے۔ ایک محدود دائرے میں کئی اچھے کام بھی ہوئے لیکن اب اس میں مزید کاموں کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ تکرار اور غیر معیاری پن بڑھ رہا۔ معترضین کے نزدیک اس کی متعدد وجوہات ہیں تاہم تحقیق کے خود ساختہ طے کردہ اصول، بنیادی مسئلہ ہیں۔ طریقۂ کار اور نتائج واسالیب بھی ان اصولوں کی وجہ سے متاثر ہو رہے ہیں۔ تحقیق کا پھیلاؤ کم ہوتا جا رہا ہے اور گھٹن کا احساس غالب ہے۔ مروج تحقیق جدید عہد کی علمی و فکری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا نہیں کر رہی۔ لہٰذا اس میں وسیع پیمانے پر تبدیلی لائی جانی چاہیے۔۔۔ اس تبدیلی کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ اردو ادبی تحقیق کے لیے کس حد تک مفید یا ضرر رساں ہے، اس کی ایک مختصر جھلک ذیل میں پیش ہے۔

اردو ادبی تحقیق میں تنقید کا عمل دخل قدیم سے ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ اس کا ذکر ضمناً پہلے بھی کیا جا چکا ہے اور باوجود اختلافات کے یہ واضح ہے کہ اردو تحقیق سے تعلق رکھنے والے بیشتر علماء کے نزدیک تحقیق اور تنقید کا باہمی ربط و تعلق ایک مستحسن عمل ہے اور اس سے دونوں شعبہ ہائے علم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تحقیق، تنقید سے اثر لے کر اپنے عمل اور نتائج کو بہتر طور پر پیش کر سکتی ہے اور تنقید، تحقیق کی معاونت سے اپنے مفروضات کو ٹھوس شکل دے سکتی ہے۔ تحقیق اور تنقید کے تعلق پر لکھے گئے اکثر مقالات میں یہی فکر ملتی ہے اور دونوں علوم کی جداگانہ حیثیتوں کو مدنظر رکھ کر ان کے ملاپ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تاہم بعض مقالات ایسے بھی ہیں جن میں بات تو تحقیق و تنقید کے تعلق پر ہی ہے لیکن ایک نئی معنویت کے ساتھ۔ اس نئی معنویت کے بابت جاننے کے لیے ڈاکٹر محمد حسن کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔ تنقیدی شعور کے بغیر تحقیق کا کام ادھورا اور ناقص ہے۔ تحقیق کا کام صرف حقائق کے غیر مربوط اور بے ہنگم انبار سے پورا نہیں ہوتا جب تک ان حقائق سے مناسب نتیجے نہ نکالے جائیں یا ان کی ترتیب اس طرح نہ کی جائے کہ وہ کسی نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیں اس وقت تک تحقیق کا کام پورا

> نہیں ہوتا۔ حقائق کی اہمیت اور معنویت بھی اضافی ہوتی ہے۔ بعض حالات میں ایک حقیقت نہایت دوررس نتائج پیدا کرتی ہے اور اس لیے اہم سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے حالات میں وہی حقیقت غیر متعلق اور غیر اہم ہو جاتی ہے۔ تحقیق کا کام اس شعور کے بغیر ممکن نہیں۔" (۱۳)

یہاں اگر اس جملے "حقائق کی اہمیت اور معنویت بھی اضافی ہوتی ہے" پر غور کیا جائے تو مروج ادبی تحقیق کا پورا ڈھانچا کہ جہاں سچ، صداقت اور حقیقت کو بطور اصلی قدر کے مراد لیا گیا ہے، ہلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سطح پر تحقیق میں تنقید کی شمولیت، تحقیق و تنقید کا ربط و تعلق اور تحقیق میں تنقید کی ضرورت و اہمیت جیسی بحثیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کہ مذکور فکر کے تحت خود تحقیق کا تنقیدی ہونا ایک لازمی اور ضروری شرط بن جاتا ہے۔

اسی تسلسل میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے الفاظ دیکھیے:

> "ہمارے ادب میں تحقیق کو نہایت محدود معنی میں مقید کر دیا گیا ہے۔ اس کا دائرہ کار بے حد سکڑ کر رہ گیا ہے اور یوں تحقیق ایک چھوٹے سے دائرے میں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ تحقیق سے ہمارے محقق بالعموم یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی شخصیت یا عہد کے بارے میں اعداد و شمار اور واقعات مستند ذرائع سے حاصل کر لیے جائیں اور پھر ان کو مربوط طور پر بیان کر دیا جائے۔ اس قسم کے تصورات سے اردو تحقیق کا دامن بہت سکڑ گیا ہے۔۔۔ یہ تحقیق کا نہایت غلط تصور ہے اور اس غلط تصور کی ترویج سے اردو تحقیق کو بہت نقصان پہنچا ہے۔" (۱۴)

ڈاکٹر محمد حسن کی یہ رائے بھی دیکھیے:

> "۔۔۔ تحقیق کے جوش و خروش میں ایک طرف تو ہر مخطوطے یا نایاب نسخے کے بارے میں صفحے کے صفحے بیانیہ انداز میں سیاہ کیے جا رہے ہیں۔ جن

> میں بعض ایسے بھی ہیں کہ اپنے زمانے میں بھی وہ پنساریوں کے ہاں پڑیاں باندھنے کے علاوہ اور کسی کام نہ آتے دوسری طرف اس بیانیہ قسم کی تحقیق نے اپنا تعلق تنقید سے بہت کچھ توڑ لیا ہے۔"(۱۵)

تحقیق نے اپنا تعلق تنقید سے توڑ لیا ہے۔ (اسے جوڑا جانا ضروری ہے!) آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: "یہاں دونوں میں سے کسی کے غیر ضروری یا کم ضروری ہونے کا سوال نہیں دونوں کے لازم وملزوم ہونے کا اعتراف لازم ہے۔"(۱۶)

لازم وملزوم ہونے کا اعتراف لازم ہے! ۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو جدا فکر اور طریقۂ کار رکھنے والے علوم کو ایک کیسے مان لیا جائے؟ اس کی صورت فقط یہی ہو سکتی ہے کہ کسی ایک کو دوسرے کے زیر کیا جائے۔ یقیناً اس ضمن میں تحقیق کی گردن مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسی کے دائرۂ کار کی محدودیت زیر بحث ہے۔ اس سلسلے میں ذرا کھل کر بات ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کہی ہے۔ ان کے نزدیک اس وقت اردو تحقیق کو پیراڈائم شفٹ کی اشد ضرورت ہے۔ محدودیت کی جڑ اصل میں تحقیق کا 'حقیقت' کے بارے میں نقطۂ نظر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تحقیق کے پیراڈائم کا مرکزی اصول اگر یہ ہے کہ حقیقت باہر اور معروضی طور پر موجود ہے، اس لیے وہ واحد اور غیر مشتبہ ہے تو تنقید کے پیراڈائم کا کلیدی اصول یہ ہے کہ حقیقت موضوعی ہے، اس لیے وہ واحد نہیں اور تعبیر طلب ہے۔ چوں کہ تنقید کا یہ بنیادی اصول اردو تحقیق کے مرکزی اصول سے ٹکراتا ہے، اس لیے اردو تحقیق، تنقید سے، عام طور پر نفور ہے۔"(۱۷)

بات واضح ہے کہ تحقیق کا تصور حقیقت معروضی ہے اور تنقید کا موضوعی۔ تنقید اپنے اس رہنما اصول کی بدولت پھل پھول رہی ہے اور تحقیق اپنے رہنما اصول کی وجہ سے محدود ہوتی جا رہی ہے۔ وسعت اور کشادگی کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق اپنا بنیادی اصول

بدلے۔ تاکہ تنقید سے نفور کے اصل سبب کا قلع قمع ہو! وہ مزید لکھتے ہیں:

> ”تنقید کی تعبیر پسندی سے خود کو دور رکھ کر اردو تحقیق، تاریخ کے خاص محور پر طے ہونے والی نظری بنیادوں کو اٹل اور ناقابلِ تغیر سمجھنے اور ایک ہی ڈگر پر آنکھیں میچے رواں رہنے کے علاوہ ادب کے عمرانی اور ثقافتی سوالات / مسایل سے سرد مہری برتنے کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلط فہمی نہیں ہوسکتی کہ عمرانی اور ثقافتی سوالات کا تعلق محض تنقید سے ہے۔ حق یہ ہے کہ تحقیق کے لیے یہ سوالات زیادہ اہم ہیں۔ تاہم تحقیق کے لیے یہ سوالات اسی وقت اہم ہوسکتے ہیں، جب تحقیق کا ایک نیا مفہوم مرتب کیا جائے۔ اس وقت اردو میں تحقیق کا جو مفہوم رائج یا تحقیق کے جو پیراڈائم کارفرما ہیں، یہ عمرانی، ثقافتی اور فلسفیانہ سوالات کی دستک تک سننے کے روادار نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ”رائج اردو تحقیق“ اپنے حال میں مست ہے۔“ (۱۸)

تحقیق کا ایک نیا مفہوم مرتب کیا جائے، جو عمرانی، ثقافتی اور فلسفیانہ سوالات کے جواب دے! اس کے لیے یقینی طور پر تحقیق کو اپنے قدیمی مفاہیم کھونا پڑیں گے اور معروضی کے بجائے موضوعی ہونا پڑے گا۔ (۱۹) یہ بظاہر سادہ اور آسان نسخہ ہے لیکن غور کیا جائے تو اس تبدیلی سے اردو ادبی تحقیق میں وسعت تو آئے گی لیکن تحقیق کی وہ متعینہ شناخت مسخ ہو کر رہ جائے جس کی تشکیل میں برسوں صرف ہوئے۔ اصول تحقیق کا علم جو روایت کے ایک طویل مدتی تسلسل سے حاصل و مرتب ہوا، ایک تھوڑے سے حصے کے سوا، سب بے کار ہو جائے گا۔ تحقیق کی نئی صورت کیا ہوگی اور اس کے اصول و طریقے کہاں سے آئیں گے، اور اسے تنقید سے کن بنیادوں پر مختلف سمجھا جائے گا؛ اس سلسلے میں واضح جوابات موجود نہیں۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہی واحد حل ہے؟ کیا تحقیق ..کے رہنما اصولوں اور شناختوں کو

بدلے بغیر بہتری کی کوئی گنجائش نہیں؟ کیا ایک مخصوص تہذیب اور اس تہذیب کے علمی و فکری منبعے سے وابستہ شعبۂ علم کے قائم و برقرار رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی؟ کیا ضروری ہے کہ ایک علم کو دوسرے کی نسبت سے ماپا تولا جائے؟ اور کیا محدودیت بھی ایک اضافی قدر نہیں؟

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اردو ادبی تحقیق کے حوالے سے اختلافی مباحث میں یہ بات کہ اردو تحقیق کو اپنے دامن میں وسعت لانی چاہیے، بھلی معلوم ہوتی ہے اور یقیناً اس مطالبے کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ بات کہ اردو تحقیق کو پیراڈائم شفٹ کی ضرورت ہے، بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ غیر ضروری اور بعید از امکان ہونے کی بنیاد پر کھٹکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جدید عہد میں علوم کی نئی گروہ بندی کی بدولت کئی علوم ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں اور ترقی یافتہ ممالک کی علوم و فنون پر روز افزوں گرفت کی بدولت چھوٹی انسانی/لسانی جمعیتوں کے لیے اسے قبول کرنا ایک مجبوری بن چکا ہے؛ حقائق کی بنیاد پر یہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ فی الحال اردو ادبی تحقیق پر یہ مجبوری لاگو نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ تو اس کے اصول اور بنیادی شناختی زاویے معدوم ہیں اور نہ مردہ و جامد کہ انھیں دفنا دیا جائے۔ ایک زندہ علمی روایت کے طور پر اردو ادبی تحقیق کو دیکھنا اور اس کی شناخت کو مسخ کیے بغیر بہتری کے لیے کوشاں ہونا، ایک درکار صحت مند رویہ ہے۔ اس سے اردو ادبی تحقیق کا تسلسل جاری بھی رہے گا اور اس کے دامن میں وسعت بھی آئے گی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تحقیق کے مروج نظام کو مسخ کیے بغیر بہتری کیسے لائی جائے تو اس کا فوری جواب تربیتی نظام پر توجہ دینا ہے۔ سکالرز کو تحقیق کے مدعا و مقصد، اہداف، اصول و قوانین اور طریقۂ کار سے آگاہ کرنے کے لیے جامعات میں بطورِ خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اور یہ بجا کہ کم و بیش ہر جامعہ میں اعلی تدریسی سطحوں پر تحقیق و تدوین کا کورس موجود ہے لیکن بیشتر دیکھا گیا ہے کہ اس کورس کو پڑھانے والے موزوں و متعلق نہیں

ہوتے ہیں۔ ایسوں کو نکھٹو کہنا مناسب ہے۔ یہ درشت بات ہے لیکن حقائق اس سے بھی زیادہ درشت بات کے متقاضی ہیں۔ (۲۰) افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تحقیق کے زوال، تحقیق کی خرابیوں، اور تحقیق کے مردہ ہو جانے کی بابت بہت کچھ بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے محرکات کے ضمن میں تربیت گاہوں، تربیتی نظام، تربیتی طریقہ کار اور تربیت کرنے والوں کی بابت کچھ لکھنے کا حوصلہ کسی میں نہیں۔ ترقی اور تبدیلی کے ضروری ہے کہ جامعات میں اردو تحقیق کے تربیتی عمل کو موثر بنایا جائے۔ اردو اصولِ تحقیق و تدوین پر نظر اور عملی تحقیق کا تجربہ رکھنے والے اساتذہ کو تدریسِ تحقیق پر مامور کیا جائے۔ نصاب میں نظری مباحث کے ساتھ عملی مشقیں بھی رکھی جائیں اور معیار کو اس سختی کے ساتھ روا رکھا جائے کہ سکالر محنت، دلچسپی اور سنجیدگی سے کام کرے یا بھاگ جائے۔

ترقی و تبدیلی کے لیے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اصولِ تحقیق کی تمام کتب کو تجزیے کے عمل سے گزارا جائے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ کئی کتب کو اساتذہ اور سکالرز نے حرفِ آخر سمجھا ہوا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں بہت سا مواد محض نقل در نقل ہے۔ بھرتی بھی اچھی خاصی ہے اور پتلی لسی میں اور پانی ملانے کا رویہ بھی ہے۔ تکمیلیت کا دعویٰ تو ہے لیکن اندراجات اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے۔ تجزیاتی عمل کے ذریعے ان کمیوں کو نشان زد کر کے متبادل صورتیں وضع کی جا سکتی ہیں۔ اساتذہ اور سکالرز اس ذمے داری کو نبھانے پر مائل ہوں تو یقیناً اردو تحقیق میں ایک نیا تسلسل آغاز ہو سکتا ہے۔

خود احتسابی ایک عمدہ رویہ ہے۔ تحقیق سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم کو یہ رویہ اپنانے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اردو تحقیق کی روابت میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ خود محققین نے ایک دوسرے کے تساہل کو نشان زد کیا اور درشتی کے ساتھ معیار کو ملحوظ رکھنے کا احساس پیدا کیا۔ حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے محاکمے اس ضمن میں قابل ذکر بھی ہیں اور لائق تقلید بھی۔ اس قسم کے احتساب کے لیے جو علم، حوصلہ اور جرأت درکار ہے، اس

کے لیے آج کے محقق کو کوشاں ہونا چاہیے۔ بخیے ادھیڑے اور ادھڑوائے بغیر ترقی ، درستی، وسعت اور تبدیلی کا خواب محض خواب ہی رہے گا۔ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں عملاً آگے بڑھا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تحقیق میں جتنی بے راہ روی سندی مقالات کی بدولت آئی ہے اتنی کسی دوسرے ذریعے سے نہیں آئی۔ تحقیق کے نام پر دھڑا دھڑ مقالے لکھے جا رہے ہیں، ان پر معیاری ہونے کی مہریں بھی لگ رہی، ڈگریاں بھی مل رہی ہیں اور گھن گرج کے ساتھ یہ مقالے چھپ بھی رہے ہیں۔ مشاہدے اور تجربے میں صورتِ حال کے ایسے ایسے رخ ہیں کہ ’بہت کچھ‘ کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ یعنی انتہائی پریشان کن حقائق ہیں۔ لازم ہے کہ ان سندی مقالات کا ریویو ہو، بالخصوص پی ایچ ڈی کی سطح کے تمام تکمیل شدہ مقالات کو تجزیے کے عمل سے گزارا جائے۔ اور زیر تکمیل مقالات میں معیار کے حوالے سے درشت رویہ اختیار کیا جائے۔ اساتذۂ تحقیق اس طرف مائل ہوں اور دوستیاں نبھانے کے بجائے علم کی ترویج و توسیع کو اپنا شعار بنائیں تو مزید بگاڑ سے بچا جا سکتا ہے۔

اردو ادبی تحقیق میں مذکورہ خرابیوں کو دور کر کے وسعت اور ہمہ گیریت لائی جا سکتی ہے۔ اس تحرک سے اردو ادبی تحقیق کا اصل روپ بھی بحال ہو گا اور کئی نئے اور مثبت زاویے بھی تشکیل پائیں گے۔ یہی طرز فکر تبدیلی و ترقی کی اصل، موثر اور قابل قبول صورت ہے۔ جہاں تک جدید عہد کے علمی و فکری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا معاملہ ہے، یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو تحقیق کا کوئی اصول، نظریہ اور ضابطہ و قانون اس پر قدغن نہیں لگاتا۔ روایت کے بغور مطالعے سے یہ جان لینے میں مشکل پیش نہیں آتی کہ اردو تحقیق نے تحقیق کے متنوع رویوں کو قبول بھی کیا اور ان کے پھیلاؤ کے لیے سہولت بھی بہم پہنچائی۔ اردو ادبی تحقیق کے مختلف دبستانوں کا وجود اس حقیقت کی تفہیم و تصدیق کا ایک اہم حوالہ ہے۔ اس کے باوجود اگر تحقیق کے جدید تقاضے پورے نہیں ہوتے

تو بہتر یہی ہوگا کہ اردو تحقیق کے مروج نظام کو اتھل پتھل کرنے کے بجائے 'نئی تحقیق' کے عنوان سے عالمی سطح پر رائج نظامِ تحقیق کو من و عن قبول کر لیا جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں زندگی کے دیگر سماجی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور علمی شعبوں میں، رائج عالمی فیشنز، نظریات اور معیارات کو حرفِ آخر سمجھ کر قبول کیا اور اپنایا جا رہا ہے۔ ترقی اور بہتری اگر مقصود ہے تو اس کے لیے کسی بھی امکانی صورت کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ تاہم لازم ہے کہ موجود کو مدنظر رکھتے ہوئے درست و نادرست کی بابت بھی سوچ لیا جائے۔

حوالہ جات / حواشی

۱۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۷ء، ص ۹

ڈاکٹر محمد حسن کے نزدیک بھی: ''تحقیق دراصل سچائی کی تلاش ہے۔'' تاہم یہ سچائی یا صداقت ان کے ہاں مطلق صداقت نہیں بلکہ وہ صداقت ہے جو محقق کی دسترس میں ہو یا ہو سکتی ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''تحقیق کی تعریف کرتے وقت بھی اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تحقیق مخصوص حالات میں اور مخصوص شواہد اور روایات کی روشنی میں اس صداقت کی تلاش ہے جو محقق کی دسترس میں ہو یا اس کی دسترس میں ہو سکتی ہو۔ اس صورت میں تحقیق مطلق صداقت کی دریافت کا دعویٰ نہیں کر سکتی؛ اس کی تلاش بھی اضافی ہوگی، اس کے وسائل بھی اور اس کے نتائج بھی۔۔۔ تحقیق اپنے زمان و مکان کے حدود میں رہ کر صداقت کی تلاش کر سکتی ہے، مطلق صداقت اس کے دائرے اور دسترس سے باہر ہے۔'' (محمد حسن، پروفیسر، ادبی تحقیق کے بعض مسائل، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق (جلد دوم)، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۵)

۲۔ قاضی عبدالودود، اصول تحقیق، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق (جلد دوم)، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص ۲۷

رشید حسن خان، قاضی صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقائق کی بازیافت، تحقیق کا مقصد ہے۔ اس کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ: ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے''۔۔۔ اس کے لیے یہ ماننا ہوگا کہ حقیقتِ واقعہ (یا اصلی شکل) بہ ذات خود موجود ہوتی ہے، خواہ معلوم نہ ہو۔ اس بنا پر یہ بات بھی ماننا ہوگی کہ ایسی رائیں جو تاویل اور تعبیر پر مبنی ہوں، واقعات کی مرادف نہیں ہو سکتیں؛ کیونکہ وہ فی نفسہ کسی امر کی اصلی شکل نہیں ہوتیں۔ تعبیرات پر حقائق کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہی

صورت قیاسات کی ہے۔ کسی امر کی اصلی شکل کا تعین اس وقت ہوگا جب اس کا علم ہو۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کا معلوم نہ ہونا، اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا؛ لیکن ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بہ طورِ واقعہ اس کی صورت میں متعین ہوگا جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہو۔" (رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۷)

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، تحقیق وتنقید، مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق (جلد اول)، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ورڈویژن پبلشرز، اسلام آباد، طبع چہارم ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۴۔ عبدالستار دلوی، ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریقہ کار، بمبئی یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳

۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹

۶۔ عبدالرزاق قریشی، فن تحقیق، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق (جلد اول)، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ص ۷۲۔۷۱

۷۔ نذیر احمد، تاریخی تحقیق کے بعض بنیادی مسائل، مشمولہ: تحقیق شناسی، مرتبہ رفاقت علی شاہد، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک بھی: "تحقیق دراصل تلاش وجستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور ان کی تصدیق کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں۔ اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ (تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق (جلد اول)، ص ۶۷۔۶۶

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷

۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، ص ۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۱۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، اردو تحقیق: صورتحال اور تقاضے، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۹

۱۲۔ یہاں ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان کی مندرجہ ذیل رائے ضرور پیش نظر رہنی چاہیے:

"تحقیق کی روح اور جان تو یہی ہے کہ حقائق کی تلاش کی جائے اور اچھی طرح چھان بین

کی جائے، اور بلا شبہ نامکمل ہے اگر تعبیر و تشریح کے ساتھ نہ ہو۔ یا بہ الفاظِ دیگر اگر اس کے ساتھ تنقید نہ ہو۔ تاہم حقائق کی تلاش کی خود اپنی ایک اہمیت ہے۔ گو کہ اس کے ساتھ تعبیر و تنقید کا عمل نہ بھی ہو، یہ پھر بھی غیر اہم چیز نہیں ہے، یا پھر بھی افادیت رکھتی ہے۔ ہاں تحقیق کے بغیر تنقید گویا ٹیڑھی دیوار آسمان تک اٹھانا ہے، اس لیے لازم ہے کہ اہم تحقیق کو کسی طور غیر اہم نہ جانیں۔ وہ مکمل تحقیق ہے تو آفرین، جزوی تحقیق ہے تو پھر بھی غیر اہم نہیں۔'' (غلام مصطفٰی خان، ڈاکٹر، تحقیق کے بنیادی لوازم، مشمولہ: تحقیق شناسی، ص ۳۵)

۱۳۔ محمد حسن، پروفیسر، ادبی تحقیق کے بعض مسائل، مشمولہ: آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۵

۱۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، ص ۱۴

۱۵۔ محمد حسن، پروفیسر، ادبی تحقیق کے بعض مسائل، ص ۴۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۵۔۴۴

۱۷۔ ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، اردو تحقیق کے پیراڈائم پر ایک نظر: سماجی سائنسوں کے پیراڈائم کی روشنی میں، مشمولہ: لسانیات اور تنقید، (ای بک) اردو دوست ڈاٹ کام، ص ۱۳۵

ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ نے اپنے اس مضمون میں کئی دیگر باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ:

''حقیقت کی تلاش کو اردو تحقیق اپنا پہلا اور شاید آخری سروکار قرار دیتے نہیں تھکتی۔ حقیقت یا امر واقعہ کی صحت کے ضمن میں اردو تحقیق جس کدو کاوش اور جاں فشانی کا مظاہرہ کرتی ہے، وہ بے مثال ہے مگر خود اردو تحقیق کی 'نظر' یا پیراڈائم کی حقیقت کیا ہے، اس کے ضمن میں اردو تحقیق نے تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اردو تحقیق کے نظری اور تجزیاتی مباحث میں یہ سوال شاید ہی اٹھایا گیا ہو کہ اردو کی ادبی تحقیق کے علمیاتی ماخذ کیا ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب غالباً علمی خروش میں یہ بات کہہ گئے ہیں حالانکہ اردو تحقیق کی تعریفوں اور ان کی توضیحات میں علمیاتی ماخذ کے واضح اشارے موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے مقالے میں بھی انھی اشارات کو بنیاد بنا کر تفاصیل دی ہیں۔ کبار محققین کی بعض تحریروں میں الگ سے بھی مذکورہ سوال اور اس کا جواب ملتا ہے۔ الفاظ یقیناً مختلف ہیں

لیکن مفہوم وہی ہے جو مطلوب و درکار ہے۔ 1987ء کی مطبوعہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحریر بعنوان ''تحقیق کے بنیادی لوازم'' ملاحظہ ہو جس میں ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے علمیاتی مآخذ کو مذہبی تناظر میں پیش کرنے کے بعد اردو تحقیق کے موجود پر گفتگو کی ہے اور چند سوال اٹھائے ہیں۔ متعلقہ اقتباس دیکھیے:

''سب سے پہلے تو یہی غور طلب ہے کہ کس حوالے سے ہم تحقیق کے بنیادی لوازم تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ادبی اور تاریخی تحقیق کے حوالے سے؟ سماجی تحقیق کے حوالے سے؟ تجرباتی تحقیق کے حوالے سے؟ جدا جدا حوالوں کے ساتھ جدا جدا بنیادی لوازم، یا یوں کہیے کہ تحقیق کا انفراسٹرکچر بدلتا جائے گا۔ یہ تبدیلی ہمارے تصورِ تحقیق کے لحاظ سے بھی رونما ہو سکتی ہے۔ ہم تلاشِ حقیقت کا تصور رکھتے ہیں یا سچ کی پہچان ہمارا مسئلہ ہے، تو ایک بات ہوگی۔ معلومات سے مطابقت والا ایک قابل قبول حل مطمحِ نظر ہے تو دوسری بات۔ دونوں صورتوں میں بنیادی لوازم بھی کچھ نہ کچھ بدلیں گے۔'' (مشمولہ تحقیق شناسی، ص۳۳_۳۲)

اسی ضمن میں قاضی عبدالودود نے سوالوں کے بجائے فیصلہ سنایا ہے۔ یہ فیصلہ بھی تحقیق کے مذہبی پس منظر اور ایک واضح علمیاتی سیاق کی دین ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک امریکی مصنف نے سٹریل کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ خارجی حقیقت (Objective Reality) کا وجود نہیں۔ مجھے اس سے انکار ہے۔ حقیقت موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے پاس اس کے دریافت کرنے کے نامکمل ذرائع ہوں۔'' (مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق (جلد دوم)، ص ۲۷

۱۸۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، اردو تحقیق کے پیراڈائم پر ایک نظر: سماجی سائنسوں کے پیراڈائم کی روشنی میں، مشمولہ: لسانیات اور تنقید، ص ۱۳۵

۱۹۔ رشید حسن خان نے اس ضمن میں بڑی واضح اور دوٹوک بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔ تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت، تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے

پر مختلف لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ جب کہ تحقیق میں اختلافِ رائے کی اس طرح گنجائش نہیں۔ اس زمانے میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جائیں جو اصلاً تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ تحقیق اور تنقید، دونوں کی حق تلفی ہے۔ تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔ تحقیق، بنیادی حقائق کا تعین کرے گی اور ان کی مدد سے ایسے نتائج نکالے جاسکیں گے جن میں شک یا قیاس یا تاویل یا ذاتی رائے کا عمل دخل نہ ہو۔ اخذِ نتائج میں جہاں سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اور ان پر مبنی اظہارِ رائے کا پھیلاؤ شروع ہوگا، وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہوجائے گی۔" (ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، ص ۱۲)

۲۰۔ پاکستان اور ہندوستان کی جامعات کا ایک عمومی سروے ہی اس ضمن میں چشم کشا حقائق سامنے لانے کو کافی ہوگا۔ باخبر اساتذہ جانتے ہیں کہ جامعات میں علمیت اب ایک تہمت بن کر رہ گئی ہے اور جہالت اتنی زور آور ہے کہ الاماں۔ سازشوں، منافرتوں اور اوچھے ہتھکنڈوں کے ساتھ ترقیاں لی اور دی جارہی ہیں۔۔ علم بک رہا ہے۔ جامعات میں تحقیق کے زوال کی بابت رشید حسن خان کی کتاب "ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ" کے صفحات ۵۷ تا ۸۷ پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہاں چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

"۔۔۔ یہ صورت طلبہ ہی کی نہیں، بہت سے اساتذہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ اصولوں کی ہواؤں میں بہت اونچے اڑیں گے، انگریزی کی کتابوں کے حوالوں کے انبار لگادیں گے اور لفظوں کے توتا مینا ایسے بنائیں گے کہ واہ واہ اور سبحان اللہ؛ مگر نثر کی کسی اہم کتاب کا ایک صفحہ بہ مشکل پڑھ پائیں گے اور ذرا مشکل نظم کے دو شعروں کو صحت کے ساتھ پڑھنے اور معنی مطلب بیان کرنے کی نوبت آجائے تو زبان لکنت کرنے لگے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جب تحقیق فرمائیں گے تو سارا زورِ طبع سیاسی اور سماجی پس منظر پر صرف کریں گے اور تاویل کے زور سے اسی کو اصل چیز ثابت کرنا چاہیں گے اور یہی فن اپنے طلبہ کو سکھائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب علموں میں تحقیقی شعور پیدا کرنے اور اس سلسلے میں عملی تربیت کی بہت بڑی ذمے داری اساتذہ پر ہے اور بہت سی خرابیوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔" (ص ۶۰۔ ۵۹)

''۔۔۔تیسرا گروہ ان حضرات پر مشتمل ہے جو ملک کی اعلیٰ دانش گاہوں میں استادی کے منصب پر فائز ہیں، اردو تحقیقی خلفشار کی سب سے زیادہ ذمے داری اسی گروہ کی ہے۔ ان میں اچھی خاصی تعداد تو ان لوگوں کی ہے جو صرف ''صاحبِ اسناد'' ہونے کے گناہ گار ہیں۔ انھوں نے علم و دریافت کے سب مرحلوں کو ایک جست میں طے کیا ہے۔ ان کو لکھنے پڑھنے سے زیادہ دوسرے ذرائع پر اعتماد ہے اور سلیقے سے کام لے کر، ان ذرائع سے فائدہ اٹھانے کا گُر بھی جانتے ہیں۔'' (۷۳۔۷۲) ''۔۔۔یہ حضرات علم اور ریاضت سے زیادہ ہاتھ کی صفائی پر ایمان رکھتے ہیں۔'' (ص۷۳) ''۔۔۔اس طرح گویا استاد اپنے شاگردوں کو بھی سبق پڑھاتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ دیکھو سخن وریوں سہرا کہہ دیا کرتے ہیں۔'' (ص۷۴) ''۔۔۔یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے اساتذہ اپنے شاگردوں کی کس انداز سے تربیت کریں گے؟ یا یہ کہ عام طالبعلم ان حضرات سے کیا سیکھیں گے؟ جیب کاٹنے کا ایک استاد اپنے شاگردوں کو تقوے کا درس دے سکتا ہے؟ بالفرض وہ یہ غلطی کرے تو کیا ان لوگوں پر اس کی سخن سازی اور سخن آفرینی کا کچھ اثر ہوگا؟'' (ص۷۶)

سندی تحقیق کی بنیادی شناختیں اور مراحل

سندی تحقیق سے مراد جامعات میں ایم فل / پی ایچ ڈی کے لیے کی جانے والی تحقیق ہے۔ یہ تحقیق اپنے مزاج، معیار، اور طریقۂ کار کے اعتبار سے غیر سندی تحقیق سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں سکالر آزاد نہیں بلکہ پابند رہ کر کسی تفویض کردہ تحقیقی منصوبے پر کام کرتا ہے۔ اول تا آخر اس تحقیقی عمل پر نظر کی جائے تو واضح طور پر یہ کئی حصوں میں بٹا دکھائی دیتا ہے۔ سکالر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی حصے کو چھوڑے یا صرف نظر کرے۔ گویا سندی تحقیق ایک طے شدہ، منضبط عمل ہے جس کا ہر مرحلہ ناگزیر اور سکالر کے لیے کڑی آزمائش لیے ہوئے ہے۔ اصولِ تحقیق کی بعض کتب میں چند ایک مراحل پر اندراجات ملتے ہیں لیکن فی زمانہ جامعاتی / سندی تحقیق کے لوازم، مختلف مراحل، ہر مرحلے میں پیش آمدہ مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز کا فقدان ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ سکالرز واقفیت نہ ہونے کے باعث مختلف زمروں میں ناقابلِ تلافی نقصان اٹھاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ آگہی کو بڑھایا جائے اور عہد حاضر میں سندی / جامعاتی تحقیق کے مختلف مراحل کا تعین کر کے ان سے متعلق مسائل اور ان کے حل کی بابت سکالرز کو رہنمائی فراہم کی جائے۔ زیر نظر مقالے میں اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایسے مراحل کو زیادہ توجہ دی جائے جن پر قبل ازیں اندراجات نہیں ملتے یا کم ملتے ہیں۔ سکالرز کی ضرورت، سہولت اور افادے کو مسائل کی نشاندہی اور تجاویز کے ضمن میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

پاکستان میں سندی تحقیق کی موجود صورتحال پر نظر کی جائے تو یقیناً اس میں کئی نئے

کردہ معیارات کے مطابق داخلے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں ایک بڑا مسئلہ جاری سیشن میں ایک کلاس کے لیے سکالرز کی متعینہ تعداد ہے۔ تعداد میں کمی و زیادتی کی وجہ سے بسا اوقات کوئی سکالر ٹیسٹ و انٹرویو پاس کرنے کے باوجود داخلے کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ درپیش نہ ہو تو ایک اور مسئلہ بھاری بھرکم فیسیں ہیں۔ اعلیٰ سندی تحقیق کے اخراجات لاکھوں میں ہوتے ہیں جس کے لیے سکالر کو بہر حال انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ بصورت دیگر آگے بڑھنے کا امکان نہیں۔

داخلے کے بعد، فوری اور کٹھن مرحلہ کورس ورک ہے۔ اس کے ہونے کی بابت سکالرز ہی نہیں اساتذہ بھی جز بز ہیں۔ بہت سے سوالات و اعتراضات کے باوجود، کم و بیش سبھی جامعات میں یہ رائج ہے۔ ایم فل کے لیے دو سمسٹرز، ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ ڈی کے لیے چار سمسٹرز اور پی ایچ کے لیے دو سمسٹرز کا کورس ورک بہر حال کرنا پڑتا ہے۔ (٦) اس کے افادی پہلوؤں پر نظر کی جائے تو یقیناً یہ اعلیٰ سندی تحقیق سے قبل مشق و تربیت کا ایک بہترین موقع ہے۔ ہر جامعہ نے اس کورس کے لیے نصاب وضع کیے ہوئے ہیں اور جائزہ و امتحان کا طریقہ کار بھی موجود ہے۔ تاہم مشاہدے میں آیا ہے کہ بوجوہ یہ مفید عمل، محض وقت گزاری کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اکثر جامعات میں سکالرز یہ وقت ایک بوجھ سمجھ کر گوارا کرتے ہیں اور کوئی مفید سرگرمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ ضروری ہے کہ اساتذہ اور سکالرز اس موقعے کی اہمیت کو پیش نظر رکھیں۔ اساتذہ پر لازم ہو کہ وہ متعلقہ علم کے بنیادی و توسیعی مباحث کے ساتھ سکالرز میں علمی متن بنانے کی لیاقت پیدا کریں۔ مسلسل تحریری مشق کے ذریعے اکملیت (perfection) پیدا کرنے والے عناصر کو فوکس کیا جائے۔ تحقیقی نزاکتوں، تنقیدی ضرورتوں اور علمی متون میں زبان و بیان کے تقاضوں کو اولیت دی جائے۔ سکالرز میں بہ تکرار یہ سوچ راسخ کی جائے کہ تحقیق ذمے داری، دیانت، محنت اور اکملیت چاہتی ہے۔ مآخذ کی تلاش و جستجو میں دلچسپی، مطالعے کی عادت، علمی بنیادوں پر سوال اٹھانے کا

رویہ، استدلالی طرزِ تفکر اور فلاسفیکل طرزِ بیان پر زور دیا جائے۔ کورس میں کامیابی و ناکامی کو ان زمروں میں سکالرز کی ترقی کے مطابق طے کیا جائے۔ عملی مشقوں میں کامیابی کو ایچ ای سی سے منظور شدہ علمی و تحقیقی جریدوں میں اشاعت سے مشروط کر دیا جائے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کورس کے اختتام پر سکالر خود موضوع منتخب کرنے، اس کا جواز فراہم کرنے، مفروضہ بنانے اور خاکہ تیار کرنے میں مہارت حاصل کر لے۔ ساتھ ہی ساتھ مآخذ کی شناخت اور نقد و جرح پر بھی قادر ہو جائے۔ سکالرز کو جان لینا چاہیے کہ یہ دورانیہ دراصل ان کی علمی شخصیت کو بنانے اور ترقی دینے کو فراہم کیا گیا ہے۔ اس میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ خود ان کے اپنے حق میں ہے۔

۲۔ موضوع کا انتخاب و خاکہ نگاری:

موضوع کے انتخاب کا مرحلہ اعلیٰ سندی تحقیق میں ایک بہت اہم اور نازک مرحلہ ہے۔ یہاں عجلت اور بے احتیاطی میں کیا گیا فیصلہ سکالرز کے لیے وبالِ جاں بن سکتا ہے۔ سکالرز اس مرحلے پر سب سے زیادہ گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک طرف موضوع کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف نگران کا۔ دونوں کام جوئے شیر نکال لانے کے مترادف ہوتے ہیں۔ بڑا خوف یہ کہ ایک دفعہ جو موضوع طے پا گیا اور جو نگران تجویز کر دیا گیا، اسے بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سند لانا کہ مجوزہ موضوع پر پہلے کام نہیں ہوا؛ مجوزہ موضوع معیار کے مطابق ہے؛ مجوزہ موضوع اہم اور لائقِ تحقیق ہے وغیرہ۔ پھر یہ باور کرانا کہ مجوزہ موضوع سکالر کی دلچسپی کے مطابق اور قبل ازیں اس کے مطالعے اور تحقیق کا محور رہا ہے؛ بنیادی اور اہم مآخذ تک سکالر کی رسائی ہے؛ مجوزہ نگران موضوع کی مناسبت سے موزوں تر ہے وغیرہ۔ ان مسائل و معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سکالر کے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ وہ کورس ورک کے دوران اپنی دلچسپیاں طے کر لے؛ انھی کے مطابق اپنے مطالعے کو وسعت دے اور چند امکانی موضوعات کا چناؤ

کر کے اساتذہ سے مشورہ کرے۔ جامعات میں تحقیق شدہ کام کی لسٹیں دیکھے (۷) اور تازہ تفویض کیے جانے والے موضوعات کی بھی خبر رکھے۔ ساتھ ہی ساتھ نگران کے بارے میں بھی سوچ لے اور اس سے وقتاً فوقتاً رابطے میں رہے۔ ایسے سکالرز جو یہ مشق گوارا نہیں کرتے، خسارے میں رہتے ہیں۔ موضوع کے حوالے سے تاکید ہے کہ یہ لازماً سکالر کا اپنا انتخاب کردہ ہونا چاہیے۔ موضوع پر غور کرتے ہوئے سوال اٹھانا چاہیے کہ کیا موضوع اہم ہے؟ کیا موضوع قابلِ دسترس ہے؟ کیا موضوع ذاتی ذوق، دلچسپی اور مطالعے کے مطابق ہے؟ وغیرہ۔ مثبت جواب کی صورت میں موضوع کو ایک سے زیادہ عنوانات کے تحت لکھ کر نگران کے سامنے برائے مشورہ لانا چاہیے۔ بعض سکالرز کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اساتذہ کو موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں شریک کریں۔ اس سے کئی پیچیدگیاں در آتی ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ متعلقہ استاد یا اس کے تجویز کردہ چند دیگر اساتذہ سے ہی مشورہ کیا جائے اور اتفاق رائے کی صورت میں موضوع تفویض کیے جانے تک اس کی تشہیر نہ کی جائے۔

موضوع کے انتخاب کے ساتھ ہی خاکہ ترتیب دینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے میں سکالر کو نگران کے مشورے اور رہنمائی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ فی زمانہ خاکہ نگاری محض ابواب بندی نہیں بلکہ یہ تحقیقی منصوبے کو سائنسی بنیادوں پر ایک ڈھانچہ فراہم کرنے کا عمل ہے۔ اس ڈیزائین میں بنیادی اور اہم بات مفروضے کا تعین اور اس کے تحت سوالات کی تشکیل ہے۔ یہی وہ کلیدی تختہ ہے جو مجوزہ تحقیق کے لیے طریقۂ کار، بنیادی و ثانوی مآخذ اور حدود و دائرۂ عمل کا تعین کرتا ہے۔ خاکہ سازی میں واضح طور پر نشاندہی ہونی چاہیے کہ مجوزہ موضوع کی ضرورت و اہمیت اور جواز کیا ہے؟ تحقیقی عمل کے ذریعے کن نکات کو کیسے زیر بحث لایا جائے گا؟ وسائل کیا ہوں گے؟ بنیادی سوالوں کے جواب کس تدریجی تسلسل کے ساتھ پیش کیے جائیں گے اور حاصلات و نتائج کی پیشکش کیا ہوگی؟

وغیرہ۔ خاکہ سازی میں ایک عمومی اور فاش غلطی غیر متعلق مواد کا اندراج ہے۔ یہ اندراج موضوع کی عدم تفہیم کی وجہ سے بھی ہوتا ہے اور مناسب تکنیک اختیار نہ کرنے کی وجہ سے بھی۔ یہ واضح ہے کہ کسی بھی موضوع کو ایک سے زیادہ تکنیکوں کے ساتھ زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ سکالر کو نگران کے مشورے سے موزوں ترین تکنیک کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ موضوع کی حدود کو بھی دوٹوک انداز میں سامنے لانا چاہیے۔ اس سے خاکے میں شفافیت آئے گی اور مبہم و غیر متعلق اندراجات کا امکان کم سے کم ہو جائے گا۔ خاکہ سازی میں الفاظ و اصطلاحات کا استعمال بھی خوب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ موضوع کی مناسبت سے عنوان کا چناؤ، ابواب کے مرکزی و ذیلی عنوانات اور دیگر تفاصیل کے لیے منتخبہ الفاظ بہت غور و خوض کا تقاضا کرتے ہیں۔ (۸) ضروری ہے کہ اس حوالے سے حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا جائے۔ سندی تحقیق میں سکالر کا نگران کی مشاورت سے طے کردہ موضوع اور مرتبہ خاکہ منظوری کے عمل گزرتا ہے۔ اکثر جامعات اس کام کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دیتی ہیں جس میں اندرونی و بیرونی ماہرین، سکالر اور نگران کی موجودگی میں موضوع اور خاکے پر بحث کرتے ہیں۔ اتفاق رائے کی صورت میں منظوری دے دی جاتی ہے یا ترامیم و اضافے تجویز کیے جاتے ہیں۔ بسا اوقات مجوزہ موضوع و خاکہ مسترد ہو جاتا ہے اور از سر نو یہ عمل دوہرانا پڑتا ہے۔

۳۔ مآخذ کی تلاش و فراہمی اور تسوید مقالہ:

موضوع کے انتخاب و منظوری کے بعد سکالر قدرے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایم فل کے لیے ایک سے دو سال اور پی ایچ ڈی کے لیے تین سے پانچ سال کی مدت دی جاتی ہے۔ (۹) اس دورانیے میں سکالر منتخبہ موضوع پر نگران کی رہنمائی و مشاورت کے ساتھ مقالہ لکھتا ہے۔ یہ مرحلہ مسلسل جستجو و لگن سے عبارت ہے۔ ایسے سکالرز جو اپنے کام میں سنجیدہ ہوتے ہیں وہ جلد ہی کام کا آغاز کر دیتے ہیں۔ مآخذ کی تلاش و جستجو، ان کی جانچ

پرکھ، مطالعہ کرنا و نوٹ لکھنا، ہر باب کی جزئیات کے مطابق فائلیں تیار کرنا، لکھنا اور نگران کو دکھانا، ترامیم و تجاویز کے مطابق دوبارہ لکھنا اور تصحیح کرنا، مسودہ بنانا اور اسے حتمی شکل دینا وغیرہ۔ (۱۰) یقیناً تحقیق ایسا کام ہے جس کے لیے خاصی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے تاہم تجربے میں آیا ہے کہ بعض سکالرز موضوع کے انتخاب و منظوری کے بعد بالکل بےفکرے ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو مآخذ کی تلاش میں جت جاتے ہیں اور کئی سال اسی میں لگا دیتے ہیں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ سب مآخذ جمع ہو جائیں تو لکھنا شروع کریں گے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو فوراً ہی لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے حافظے کی بنیاد پر ایک مسودہ بنا کر پھر اس میں بھرتی کرتے ہیں۔ تینوں کا طرز عمل درست نہیں۔ بہتر اور مناسب طریقہ یہ کہ منظوری کے بعد ضروری مآخذ کی فراہمی پر کچھ وقت صرف کیا جائے؛ پھر کچھ وقت مآخذ کا مطالعہ کرنے، نوٹ لینے، مواد کو ایک ترتیب میں سمجھنے اور ابواب کے مطابق فائلیں تیار کرنے میں، اور اس کے فوراً بعد لکھنے کا آغاز کر دیا جائے۔ پہلی ہی لکھت کو حتمی تصور کرنا تحقیق میں ایک بڑی غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ حتمی لکھت تک پہنچنے سے پہلے متعدد بار لکھنا، کاٹنا اور لکھنا پڑے گا۔ بعض سکالر ایک ہی بار حتمی تحریر لکھنے کے چکر میں بیٹھے سوچتے رہ جاتے ہیں اور کبھی لکھ نہیں پاتے۔ تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے لازم ہے کہ بیٹھا جائے، وقت دیا جائے، سوچ بچار کی جائے اور اس میں تسلسل کو برقرار رکھا جائے۔ بصورت دیگر مقالہ نہیں لکھا جائے گا۔ دوسرے اپنے لکھے ہوئے کو کاٹنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ تحقیق میں یہ جبر جتنی بار گوارا کیا جائے اتنا ہی مفید ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لکھا اور کاٹا جائے۔ مراد یہ ہے کہ کسی نکتے کی وضاحت میں موزوں ترین اظہار تک پہنچنے کے لیے تحریر کو کئی بار بہ نظرِ نقد دیکھا جائے۔ تحقیقی مقالے کا بیانیہ آزاد اور من مرضی کا نہیں ہوتا بلکہ یہ طے کردہ موضوع پر، طے کردہ حدود کے مطابق ایک منضبط پیشکش ہے جس میں ذاتی ذوق، وجدان اور احساسِ جمال کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ (۱۱) پس مقالہ لکھنے کے لیے ذہن کو چاک و چوبند کرنا زیادہ اہم ہے۔ سستی و بےزاری کے ساتھ سطحی شاعری تو کی جا سکتی ہے، مقالہ نہیں لکھا جا سکتا۔ مقالہ نہ لکھ سکنے کی دیگر وجوہ میں مواد کی عدم فراہمی، لکھنے کی مشق کا نہ ہونا، متعلقہ موضوع میں دلچسپی نہ ہونا، موضوع کا دقیق و پیچیدہ ہونا، نگران کا مزاج کے مطابق نہ ہونا اور ذاتی و ملازمتی مصروفیات وغیرہ شامل ہیں۔ ان مسائل پر پختہ ارادے اور مناسب حکمت عملی کے ساتھ قابو پایا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ متعینہ مدت میں مقالہ نہ لکھ سکنے کی صورت میں جامعہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ سکالر کی رجسٹریشن منسوخ کر دے۔

۴۔ مقالے کی تکمیل و زبانی امتحان:

مقالے کا مسودہ تیار ہو جانے کے بعد نگران اسے اول تا آخر بغور جانچتا ہے۔ یہ نگران کی ذمے داری ہے کہ وہ مقالے میں متن کی صحت اور دیگر تکنیکی امور پر نظر رکھے۔ مقالہ اگر کمپوز شدہ نہ ہو تو کمپوزنگ کے بعد دوبارہ نگران کو دکھایا جاتا ہے۔ مقالے کا متعلقہ جامعہ کے طے کردہ پیشکش کے طریقے کے مطابق ہونا لازم ہے بصورت دیگر یہ قابل قبول نہیں ہوتا۔ نگران اگر مقالے کے معیار سے مطمئن ہو تو وہ ایک تصدیقی سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے جس کی بنیاد پر سکالر مقالے کو مزید پرکھ اور منظوری کے لیے جامعہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کو جانچ کے لیے بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک ماہرین کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ رپورٹس آنے پر زبانی امتحان کا مرحلہ آتا ہے جس میں سکالر سے، متعلقہ ماہرین اس کی تحقیق کی بابت سوالات کرتے ہیں۔ مثبت نتائج کی صورت میں سکالر مطلوبہ سند کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ اس مرحلے میں قدم قدم پیچیدگیاں اور مسائل ہیں۔ اول تو نگران ہی تصدیقی سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے قبل سکالر کو ناکوں چنے چبواتا ہے۔ مقالے میں مطلوبہ معیار کے حوالے سے چونکہ نگران کو بھی کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اس لیے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مقالہ ہر اعتبار سے درست و موزوں ہو۔ مقالہ جمع ہو جانے کے بعد اس

کی پرکھ کا عمل سست روی سے آگے بڑھتا ہے۔ بعض جامعات میں یہ مرحلہ چند مہینوں اور بعض میں سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ کبھی جامعہ کی طرف سے تساہل برتا جاتا ہے اور کبھی ماہرین رپورٹس بھیجنے میں دیر کر دیتے ہیں۔ رپورٹس میں ماہرین کی پسند ناپسند، نظریاتی وابستگی، موضوع سے اختلاف و اتفاق، اور بسا اوقات نگرانِ مقالہ سے تعلق و بے تعلقی بھی آڑے آتی ہے۔ رپورٹس اگر مثبت آئیں تو خیر، اگر منفی آئیں تو سکالر کو ان کی روشنی میں ترامیم و اضافے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد زبانی امتحان کا انعقاد ہوتا ہے۔ زبانی امتحان میں جامعہ کے اساتذہ کے ساتھ ان ملکی ماہرین کو بھی بلایا جاتا ہے جن کے پاس مقالہ پرکھ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بعض سکالرز جو بولنے میں طاق نہیں ہوتے، اس مرحلے پر سخت پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسے سکالرز بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جنہوں نے اپنے موضوع کو پورے طور پر نہیں سمجھا ہوتا۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ اکثر سکالرز ہچکچاہٹ کے باعث اپنی تحقیق کی بارے میں بنیادی سوالوں کا بھی جواب نہیں دے پاتے، نتیجتاً ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس مرحلے پر ضروری ہے کہ سکالر پُر اعتماد اور حاضر جواب ہو۔ مقالہ لکھنے کے مقابلے میں یہ ایک بالکل مختلف تجربہ ہے لہذا اس کے لیے الگ سے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

حوالہ جات / حواشی

۱۔ سندی تحقیق کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان نے بتدریج ضوابط وضع کیے ہیں۔ بالخصوص ۲۰۰۵ء کے بعد ایک جامع پالیسی کے تحت مسلسل اقدامات ملتے ہیں۔ ان میں ایم فل / پی ایچ ڈی کورسز میں داخلے کے لیے نئی حکمت عملی اور قواعد و ضوابط، کورس ورک کے رہنما اصول و ہدایات، نصاب، تدریس اور جائزہ و امتحان کے لیے تجاویز، مقالات کی پرکھ کے لیے طریقۂ کار، نگرانوں کی ایچ ای سی اپرووڈ سپروائزرز کی صورت میں معیار بندی، تحقیقی مقالات کی اشاعت کے لیے جرائد کی معیار بندی، سندی تحقیق کے لیے جامعات اور سکالرز کو خصوصی گرانٹس کا اجرا، سیمینارز اور ورکشاپس کا انعقاد، پی ایچ ڈی مقالات کی آن لائن کیٹلاگنگ، سرقہ و جعل سازی روکنے کے لیے اقدامات، ڈگریوں کی تصدیق اور آن لائن لسٹنگ وغیرہ شامل ہیں۔ ایچ ای سی ویب سائٹ پر اس ضمن میں تفصیلی معلومات مہیا ہیں۔ ملاحظہ ہو:

http://www.hec.gov.pk/Pages/main.aspx

۲۔ ایم فل / پی ایچ ڈی میں داخلے کے لیے ایچ ای سی کی ہدایات دیکھیے:

http://www.hec.gov.pk/InsideHEC/Divisions/QALI/QualityAssurance/QualityAssuranceAgency/Pages/PhDReviewCommittees.aspx

(Minimum Criteria for M.Phil/PhD Programs)

۳۔ جی آر ای (جنرل) کی تفاصیل کے لیے دیکھیے:

http://www.nts.org.pk/_Ops_Sec/Products/GATGEN/GATGEN.asp

۴۔ جی آر ای (سبجیکٹ) کی تفاصیل کے لیے دیکھیے:

http://www.nts.org.pk/_Ops_Sec/Products/GATSUB/GATSUB.asp

۵۔ بحوالہ ویب سائٹ مذکور (nts)

۶۔ کورس ورک کا دورانیہ، متعینہ کریڈٹ آورز ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ایچ ای سی کی ویب سائٹ۔ (لنک مذکور: حوالہ۔۲)

۷۔ اردو سندی تحقیقی مقالات کی ایک لسٹ ایچ ای سی نے شائع کی ہے۔ دیکھیے: جامعات میں اردو تحقیق، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، ہائر ایجوکیشن کمیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۸۔ اردو تحقیقی مقالات میں اس مسئلے پر راقم کا مقالہ ''اردو تحقیقی مقالات میں عنوان سازی'' ملاحظہ ہو۔ یا دیکھیے: ''اردو رسمیات مقالہ نگاری'' مرتبہ ڈاکٹر شفیق انجم، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء/ مزید دیکھیے: رسمیات مقالہ نگاری، از پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۹ء

۹۔ تفصیلی ہدایات کے لیے دیکھیے ایچ ای سی کی ویب سائٹ مذکور۔

۱۰۔ اردو میں ان مراحل پر تفصیلی اندراجات دیکھیے: تحقیق کا فن، از ڈاکٹر گیان چند، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۷ء

۱۱۔ اردو میں اس حوالے سے دیکھیے: تحقیق کا فن، ایضاً۔ (نواں باب: زبان اور بیان۔ صفحات ۶۹۔۲۳۸)

تحقیقی مقالے کی تشکیل کا اولین قدم: خاکہ سازی

سندی تحقیقی مقالہ لکھنا، تحقیقی وتنقیدی مزاج کی حامل ایک کتاب لکھنے سے مختلف عمل ہے۔ عام طور پر سکالرز کے ذہن میں تحقیقی مقالے کا تصور کتاب کے تصور سے مماثل ہوتا ہے اور اسی بنا پر ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی مقبول موضوع پر ضخیم کتاب تیار کر دیں۔ جامعات میں اردو سندی مقالات کی روایت بھی چند مستثنیات کے ساتھ اسی تصور سے جڑی نظر آتی ہے۔ سکالرز عام طور پر اسی روایت کو معیار سمجھتے اور بطور مثال قدیم میں لکھے گئے کسی مقالے کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس سے ان کے ذہن میں سندی مقالے کا کتابی تصور اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ آخر تک اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔ اس تصور میں تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ سندی تحقیقی مقالے کی ابتدائی تشکیل کے مرحلے کو فوکس کیا جائے۔ مسئلہ دراصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ تحقیقی تجویز، سناپسز، یا تحقیقی خاکہ کے نام پر جو چند صفحات سکالر کی طرف سے جمع کرائے جاتے ہیں انھیں وقت کی کمی کے باعث عجلت میں نپٹا دیا جاتا ہے۔ اگر کچھ جرح ہوتی بھی ہے تو اس کا تعلق زیادہ تر موضوع، عنوان، مآخذ کی دستیابی و عدم دستیابی اور ابواب کی ترتیب وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کچھ عرصے بعد تفویض کردہ موضوع پر ایک کتاب تیار کر کے لے آتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے اس کے پاس معلومات تو ہوتی ہیں لیکن ان کی کوئی اصولی، منطقی و معروضی بنیاد نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ سکالر یہ بتانے سے قاصر رہتا ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث کا جواز کیا ہے؟ فرضیہ کیا ہے؟ بنیادی وثانوی سوالات کیا

ہیں؟ کس سوال کا جواب کس باب میں دیا گیا ہے؟ طریقۂ تحقیق کیا ہے؟ مقالے کی حدود کیا ہیں اور ان کا تعین کن بنیادوں پر کیا گیا ہے؟ مآخذ کیا ہیں؟ اسناد کی صحت کا تعین کیسے کیا گیا ہے؟ نتائج و حاصلات کیا ہیں اور کن پیمانوں اور حدود کے ساتھ انھیں قابل اعتبار اور قابل پیمائش سمجھا جائے؟ وغیرہ۔۔۔ ان سوالات پر غور کیا جائے تو سندی تحقیقی مقالے کے درکار تصور اور عام کتابی تصور میں فرق کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔ سندی تحقیقی مقالہ یقینی طور پر منضبط طریقۂ کار کے تحت طے شدہ سوالوں کا طے شدہ حدود کے ساتھ جواب پیش کرتا ہے۔ اس تعریف کے الفاظ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن شاید اس مفہوم سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ سندی تحقیقی مقالے میں بہت کچھ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف وہ کچھ کہ جس کا تفویض کے وقت جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ سکالرز کو یہ آگہی کورس ورک کے دوران میں دی جانی چاہیے۔ انھیں باور کرایا جانا چاہیے کہ سندی تحقیق کا اہم ترین مرحلہ انتخاب و تفویض موضوع کا ہے اور تحقیقی مقالے کی حقیقی بنیاد اس مرحلے پر تیار کیا جانے والا ڈیزائن و خاکہ ہے۔ عملی مشقیں اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اردو اصول تحقیق کی بعض کتب میں 'خاکہ نگاری' کے عنوان سے جو اندراجات ملتے ہیں وہ زیادہ تر منتشر اور نامکمل ہیں۔ پس ضروری ہے اس سلسلے میں نیا مواد تشکیل دیا جائے تا کہ سکالرز اسے بطور نمونہ اختیار کر سکیں۔

سندی تحقیقی مقالے کے لیے خاکہ سازی کے عمل کو محض ابواب بندی سمجھنا صریحاً غلط ہے۔ 'تحقیق کا فن' جیسی بنیادی کتاب میں تحقیقی خاکے کو اسی مفہوم میں سمجھا گیا ہے چنانچہ صفحہ ۱۱۵ تا ۱۳۷ جو نمونے پیش کیے گئے ہیں وہ صرف ابواب سے متعلق ہیں۔ (۱) 'اردو میں اصول تحقیق' کی دونوں جلدوں میں خاکہ سازی کے عنوان کے تحت کوئی مقالہ شامل نہیں؛ ڈاکٹر ش اختر کے ایک مقالے بعنوان 'موضوع کا انتخاب' میں ضمناً کچھ معلومات ملتی ہیں۔ (۲) 'ادبی تحقیق کے اصول' از ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور رفاقت علی شاہد کی مرتبہ

کتاب 'تحقیق شناسی' میں بھی اس عنوان کے تحت کوئی مقالہ شامل نہیں کیا گیا۔ (۳) ادبی تحقیق کے عنوان سے لکھی گئی کئی دیگر کتب میں بھی یہی صورتحال ہے۔ البتہ 'اردو تحقیق' مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی میں اس موضوع کو اہم سمجھا گیا ہے اور تحقیقی ڈیزائین اور تحقیقی تجویز کے حوالے سے مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ (۴) یہ چند مقالات وقیع ہیں لیکن ایسی صورتحال میں جب خاکہ نگاری کا مفہوم ابواب بندی ذہن میں نقش ہو، ایک مختلف بات اسی صورت میں قابل توجہ و تقلید ٹھہرے گی جب اسے سہولت اور آسانی کے ساتھ سمجھایا جائے۔ پس اولیں سطح پر یہ فیصلہ کرنا اہم ہے کہ تحقیقی مقالے کی ابتدائی تشکیل کے مرحلے کو کیا نام دیا جائے۔ تحقیقی ڈیزائین، تحقیقی سکیم، تحقیقی پروپوزل، تحقیقی تجویز اور تحقیقی نقشے جیسی اصطلاحات اس ضمن میں استعمال کی جاتی ہیں اور ان میں کسی قدر معنوی فرق بھی ہے لیکن زیادہ واضح اور مقبول اصطلاح تحقیقی خاکہ ہے۔ اسی میں ڈیزائین، سکیم اور نقشے کا مفہوم شامل کر کے سکالرز کو رہنمائی فراہم کی جائے تو تفہیم میں آسانی پیدا ہوگی۔۔۔ تحقیقی خاکہ بمعنی ابواب بندی نہیں بلکہ بمعنی ایک کلی سکیم۔ جس میں واضح ہو کہ تحقیقی کام کیا ہے؟ کیوں ضروری ہے؟ کیسے انجام دیا جائے گا؟ اور کب ختم ہوگا؟ ان میں سے ہر سوال مختلف جزئیات کا حامل ہے۔ کیا، کیوں، کیسے اور کب جیسے سوالوں کے جواب عام روزمرہ معاملات میں بھی خاصے مشکل ہوتے ہیں، تحقیقی خاکے کی تشکیل میں ان کی نوعیت اور بھی پیچیدہ ہے۔ سوچ بچار، حزم و احتیاط، عمیق مطالعے اور اساتذہ سے مشاورت کے بعد ہی انھیں ترتیب دیا جانا چاہیے۔

اردو سندی تحقیق کی روایت کو مدنظر رکھا جائے تو تحقیقی خاکہ بمعنی کلی سکیم کے تصور کو مکمل طور پر اختیار کیا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ بعض اساتذہ ادبی تحقیق میں فرضیے، مسئلے اور سوال کے نام سے ہی الرجک ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے تو اپنی کتاب میں لکھ بھی دیا ہے کہ: 'ادب میں کہاں مسئلہ اور سوال ہوتے ہیں؟' اور یہ بھی

کہ: 'ادب میں ڈیٹا کہاں ہوتے ہیں'۔ (۵) گویا یہ فضول باتیں ہیں۔ یہی معاملہ کئی دیگر نکات کے حوالے سے بھی ہے۔ اس صورتحال میں ایک قابل قبول حل کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس غلط فکر کا تدارک کیا جائے کہ ادبی تحقیق میں سوال نہیں ہوتے۔۔۔ یقیناً ہوتے ہیں چاہے انھیں دھیان میں نہ لایا جائے یا بیان نہ کیا جائے۔ تحقیق کے لیے کسی موضوع کا انتخاب ہی دراصل کسی مسئلے یا سوال کی موجودگی کا اظہار ہے۔ یہ سوال معروضی، موضوعی، اہم یا کم اہم ہوسکتا ہے۔ سندی تحقیق کا اختصاص اور بنیادی تقاضا اس سوال اور ممکنہ جواب کی نوعیت فکس کرنا اور اس مقصد کے لیے ایک کلی سکیم کا اجرا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحقیقی خاکہ دراصل اہداف کے گرد ایک دائرہ کھینچے کا عمل ہے۔ یہ دائرہ جتنا واضح، چست اور مکمل ہوگا، تحقیق اتنی ہی زیادہ ثمر آور، ٹھوس اور بامعنی ہوگی۔ یہ محض ابواب بندی سے ایک بالکل مختلف سرگرمی ہے۔۔۔ ایک اچھا تحقیقی خاکہ کیسے تیار کیا جاسکتا ہے، اس کے بنیادی لوازم کیا ہیں اور کن عنوانات کے تحت کیا تفاصیل دی جانی چاہییں؟۔۔۔ سکالرز کی رہنمائی کے لیے ذیل میں چند نکات پیش ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ عام فہم انداز میں تحقیقی سکیم کے تصور کو نمایاں کیا جائے۔ موضوع کی نوعیت و ضرورت کے مطابق ان اشارات کو سمجھا اور اختیار کیا جاسکتا ہے۔

موضوع کا تعارف / اہمیت / جواز

یہ تحقیقی خاکے کا تمہیدی و ابتدائی حصہ ہے۔ اس میں مختصراً موضوع کا تعارف کرایا جانا چاہیے۔ عام طور پر سکالرز اس حصے کو داستانوی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور پس منظر واضح کرنے کے لیے بات کا آغاز تخلیق آدم یا اس سے بھی پہلے سے کیا جاتا ہے۔ یہ غلط رویہ ہے۔ واضح اور شفاف انداز میں بتایا جانا چاہیے کہ موضوع کیا ہے؟ اس کا تعلق کس عہد، علاقے، صنف یا دبستان وغیرہ سے ہے؟ اس کی اہمیت کے نمایاں پہلو کون سے ہیں اور اس پر تحقیق کن وجوہ کی بنیاد پر ضروری ہے۔

تعارف، اہمیت اور جواز کے عنوانات الگ الگ بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان کے تحت دیے گئے متن میں تکرار نہیں ہونی چاہیے۔ طوالت سے بھی گریز کیا جائے۔ دو سے تین صفحات اس حصے کے لیے کافی ہیں۔ مجوزہ موضوع پر تحقیق کی گنجائش اور اس کی متعلقہ سند / ڈگری کے معیار سے مطابقت اسی حصے میں واضح کی جاتی ہے۔ چنانچہ کوشش کی جائے کہ عبارت چست، واضح اور ٹھوس ہو۔ عام طور پر اس بیانیے میں ایک مجہول سے تعارف کے بعد یہ جملہ لکھ دیا جاتا ہے کہ "چونکہ اس موضوع پر تاحال کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا اس لیے ضروری ہے کہ پی ایچ ڈی کی سطح کا ایک مقالہ لکھا جائے۔" یا یہ کہ "اس موضوع پر کسی قسم کا کوئی تحقیقی کام نہیں۔" یا "یہ موضوع ایم فل کی سطح کی تحقیق کا تقاضا کرتا ہے؛ اس پر پہلے تحقیق نہیں کی گئی۔" وغیرہ۔ اس قسم کے جملے اکثر صورتوں میں حقائق کے منافی ہوتے ہیں۔ جو کام پہلے ہو چکا ہے، دیانت داری سے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے موضوع کی انفرادیت واضح کی جانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے سکالر کو بنیادی نوعیت کی تلاش اور جانچ پڑتال کر لینی چاہیے۔ بغیر کسی شہادت و دلیل کے مندرجہ بالا جملے محض ایک دعوٰی ہیں۔ سکالرز کی یہ غفلت، غلط بیانی یا کم علمی بعد میں ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنتی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب عین اسی موضوع پر پہلے سے موجود تحقیقی کام سامنے آجاتا ہے۔ اس مسئلے سے بچاؤ کا ایک قدرے مشکل لیکن مفید حل یہ ہے کہ ایک ذیلی عنوان 'سابقہ تحقیقات کا جائزہ' قائم کرلیا جائے۔ اس میں موضوع سے جڑے ہوئے تازہ و قدیم تحقیقی کاموں کی فہرست، مختصر تعارف و تبصرے کے ساتھ دے دی جائے۔ یہ کام محنت طلب ہے لیکن مجوزہ موضوع کی ضرورت، گنجائش اور انفرادیت واضح کرنے کا اس سے بہتر شاید ہی کوئی طریقہ ہو۔

فرضیہ اور سوالات

تعارف کے بعد اگلا مرحلہ فرضیے کی تشکیل اور متعلقہ سوالات کی نشاندہی ہے۔

تعارف میں کسی قدر فرضیے کے نشانات ہونے چاہییں۔ ایسا نہ ہو کہ تعارف کسی ایک سمت اور فرضیہ دوسری سمت جاتا محسوس ہو۔ یہ مرحلہ لازمی طور پر پہلے مرحلے سے جڑا ہوا اور ابتدائی بیانیے کی اگلی کڑی معلوم ہونا چاہیے۔ فرضیہ تشکیل دیتے وقت موضوع کے علائق کو بخوبی سمجھ لینا چاہیے۔ فرضیہ دراصل مسئلے کا امکانی حل ہوتا ہے جسے حقائق کی روشنی میں ثابت یا رد کیا جا سکتا ہے۔ (٦) فرضیے کی نوعیت کے مطابق سوالات کی تشکیل اس مرحلے میں توجہ طلب معاملہ ہے۔ فرضیہ اور سوالات تحقیق کا رخ متعین کرتے ہیں اس لیے ان میں پیچیدگی اور ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ فرضیے طے وقت کرتے وقت یہ جان لینا ضروری ہے کہ کیا اس کے حق یا استرداد میں کوائف دستیاب ہیں اور کیا ان کا تجزیہ ممکن ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ کیا یہ موضوع زیرِ بحث کے حوالے سے اس مرکزی نکتے کا احاطہ کرتا ہے جس کا کھوج لگانا مقصود ہے۔ فرضیے کی تشکیل میں احتیاط و توازن کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب سکالر فرضیے کی تشکیل سے قبل موضوع سے متعلق مواد کے بغور مطالعے کو لازم سمجھے گا۔

حدود و تحدید

اس مرحلے میں تحقیقی عمل کی حد بندی کی جاتی ہے۔ یعنی کہاں سے کہاں تک اور کتنا اور کیوں۔ بعض موضوعات میں موضوع کے لیے اختیار کیا جانے والا عنوان ہی حدود کی وضاحت کر دیتا ہے لیکن جہاں ایسا نہیں وہاں الگ سے بتایا جانا ضروری ہے۔ حدود کا مطلب اپنی مرضی اور پسند کے مطابق چھانٹی کرنا ہرگز نہیں۔ یہ مبنی بر محقق نہیں بلکہ مبنی بر موضوع عمل ہے۔ موضوع کی نوعیت، ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر متعلق و غیر متعلق کی نشاندہی اور وقت، عہد اور علاقے کی وضاحت یہاں بنیادی تقاضا ہے۔ سکالر کو واضح طور پر بتا دینا چاہیے کہ کیا بات اس کے دائرہ تحقیق میں ہو گی اور کیا نہیں اور اس کی وجہ کیا ہے۔ عام طور پر بغیر کوئی وجہ بتائے مواد منتخب کر لیا جاتا ہے، یا کچھ مواد چھوڑ دیا جاتا ہے، ادوار کی تقسیم کر

لی جاتی ہے، یا اہم اور غیر اہم کی بابت فیصلہ سنا دیا جاتا ہے؛ یہ علمی اپروچ نہیں۔ تحقیقی خاکے میں ان امور کو واضح اور ٹھوس بنیاد فراہم کرنا سکالر کی ذمے داری ہے۔ بصورت دیگر یہ سوال آخر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

طریقِ تحقیق

اس عنوان کے تحت یہ وضاحت کی جانی چاہیے کہ موضوع کی نوعیت کے مطابق کون سا طریقۂ تحقیق اختیار کیا جائے گا۔ ادبی تحقیق کے لیے عام طور پر دستاویزی / تاریخی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سوانح حیات، اداروں اور تنظیموں کی تاریخ، کتابیات، نظریات کی تاریخ، اور تدوین متن کے لیے یہی مقبول طریقہ ہے۔ اس کے اصول و لوازم تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور اصول تحقیق کی کتب میں بآسانی دستیاب ہیں۔ (٧) حقائق کی بازیافت کے لیے یہاں دستاویزات (کتب، اخبارات و جرائد، ڈائریاں، خطوط اور دیگر انفرادی دستاویزات، سرکاری و ادارہ جاتی ریکارڈ، رپورٹس اور انٹرویوز وغیرہ) کا سہارا لیا جاتا ہے۔ دستاویزات کی جمع آوری، خارجی و داخلی جانچ پڑتال، ترتیب و تشریح اور تنقید کے بعد کوئی رائے قائم کی جاتی ہے۔ تاہم اگر موضوع مندرجہ بالا پانچ نکات سے ہٹ کر ہو تو اس کے لیے نگران کے مشورے سے موزوں طریق کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ طریقِ تحقیق کے انتخاب و وضاحت سے تحقیق میں اعتباریت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں چنانچہ اس معاملے کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ موضوع سے متعلق اور موزوں ترین طریقۂ تحقیق کا انتخاب کم وقت میں بہتر اور مرتکز نتائج کی فراہمی میں معاون بنتا ہے۔ کسی موضوع کے لیے ایک سے زیادہ طریقۂ تحقیق بھی انتخاب کیے جا سکتے ہیں تاہم دلائل کے ساتھ اس کا دفاع بھی لازم ہے۔ ایسا نہیں کہ اپنی مرضی سے بغیر کسی جواز و دلیل کے فیصلہ کر لیا جائے۔ سکالر کو بتانا چاہیے کہ موضوع کی مناسبت سے منتخبہ طریقۂ کار کتنا مفید اور معاون ہو گا اور یہ بھی کہ دیگر طریقے کن بنیادوں پر موزوں نہیں ہیں۔

موضوع کی تقسیم وترتیب

اس مرحلے میں موضوع کی تفاصیل کو تدریجاً بیان کیا جانا چاہیے۔ یہ جز بندی کا سا عمل ہے جس میں عنوانات قائم کیے بغیر موضوع کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر باب میں مواد کی نوعیت واضح کی جاتی ہے اور مجوزہ ترتیب سامنے لائی جاتی ہے۔ یہ معاملہ اس اعتبار سے توجہ طلب ہے کہ یہاں سکالر کو بتانا پڑتا ہے کہ مقالے کو کتنے ابواب میں تقسیم کیا جائے گا، ان کی ترتیب کیا ہوگی، حجم اور سائز کیا ہوگا، اور کس باب میں کیا مواد شامل کیا جائے گا۔ یہ گویا ابواب کی عنوان سازی سے قبل منتشر مواد کو قرینے سے مختلف حصوں میں بانٹنے کی سکیم ہے۔ یہ سکیم اگر مناسب طریقے سے انجام پا جائے تو ابواب کی عنوان سازی کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ سکالرز کو اس سلسلے میں نگران سے ضرور مدد لینی چاہیے۔ کیونکہ ہر زمرے میں یکساں نوعیت کے مواد کا انتخاب، اس کے تقدم وتاخر، اور اس کے مرکزی و ضمنی ہونے کے ساتھ مختلف زمروں کی ترتیب و تدریجی پیشکش محض سکالر کے بس کا کام نہیں۔ باہمی مشاورت سے یہ بیانیہ سوچ سمجھ کر تشکیل دینا چاہیے تاکہ تحقیق کے دوران میں تضاد و تنافر یا تکرار کی صورت پیدا نہ ہو۔

ابواب بندی

تحقیقی خاکے میں ابواب بندی ایک لازمی اور ضروری تقاضا ہے۔ یہ واضح نشانات کے ساتھ موضوع کو پھیلانے اور سمیٹنے کے عمل کی وضاحت ہے۔ مقالہ کہاں سے کس عنوان کے تحت شروع ہوگا، کن خطوط پر آگے بڑھے گا اور کہاں کس عنوان کے تحت ختم ہوگا۔۔۔ ابواب بندی میں یہی بتانا مقصود ہوتا ہے۔ مقالے کی تنظیم و وحدت کا یہ بنیادی حوالہ ہے۔ ایک مربوط تحقیقی مقالہ مربوط ابواب کا رہین منت ہوتا ہے۔ (۸) اس حوالے سے قبل ازیں اشارات درج کیے گئے ہیں۔ یہاں ابواب بندی سے مراد ابواب کی عنوان سازی ہے۔ ابواب کو اول، دوم، سوم وغیرہ اعداد کے ساتھ نشان زد کیا جانا چاہیے اور عنوان

طے کرتے وقت موضوع کی مناسبت اور متعلقہ مواد کی نوعیت کو خوب جان لینا چاہیے۔ عام طور پر ابواب کے صرف مرکزی عنوانات طے کر لیے جاتے ہیں اور اسی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ ضروری ہے مرکزی عنوانات کے ساتھ ذیلی عنوانات بھی دیے جائیں۔ اس سے ہر باب کی نوعیت اور امتیاز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ابواب کی عنوان سازی کے ضمن میں مزید تفصیل کے لیے مقالہ بعنوان: تحقیقی مقالات میں عنوان سازی' ملاحظہ ہو۔ (۹)

بنیادی وثانوی مآخذ کی فہرست / کتابیات

تحقیقی خاکے میں بنیادی وثانوی مآخذ کی فہرست ضرور شامل ہونی چاہیے۔ اس سے سکالر کی ابتدائی تلاش و جستجو کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور موضوع سے متعلق مواد کے قابل رسائی ہونے کی شواہد بھی ملتے ہیں۔ (۱۰) سکالرز عام طور پر شائع شدہ فہرستوں یا پہلے موجود تحقیقی کاموں سے نقل کر کے یہ فہرست تیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنا ضرر رساں ہے۔ فہرست میں صرف انھی مآخذ کو شامل کیا جائے جو سکالر نے خود ملاحظہ کیے ہوں اور ان کی دستیابی کے حوالے سے اسے اطمینان ہو۔ محض تحقیقی خاکے کے صفحے بڑھانے کے لیے فہرست دینا مقصود نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق مآخذ، دستیاب اور قابل رسائی ہیں۔ بسا اوقات فہرست تو بنا لی جاتی ہے لیکن متعلقہ دستاویز یا کتاب ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں نقصان خود سکالر کو ہوتا ہے۔ فہرست سازی میں بنیادی مآخذ پر بھرپور توجہ دی جانی چاہیے۔ خیال رکھا جائے کہ ثانوی مآخذ کا اندراج کم سے کم ہو اور غیر متعلق مآخذ ہرگز شامل نہ کیے جائیں۔

تحقیقی خاکے کی ترتیب وتشکیل کے حوالے سے یہ نکات محض ایک نمونے/ماڈل کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ عنوانات اور متعلقہ تفاصیل میں موضوع کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترمیم و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ (۱۱) یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ عام طور پر

سکالرز بنے بنائے نمونوں کو حتمی تصور کرتے ہوئے من وعن تقلید کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر بطور مثال درج جملوں کو جزوی تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا جاتا۔ زیرِ نظر نمونے میں اس رویہ کی حوصلہ شکنی کے لیے مثالیں شامل نہیں کی گئیں، صرف تجاویز و اشارات دیے گئے ہیں۔ بہتر نتائج کے لیے ضروری ہے کہ کورس ورک کے دوران سکالرز سے فرضی تحقیقی خاکے بنوائے جائیں۔ مختلف مراحل میں مطلوبہ استعداد پیدا کرنے کے لیے ہر مرحلے کو بتدریج فوکس کیا جائے۔ موضوع کے انتخاب، موضوع کی اہمیت و جواز، پس منظری تحقیقی مطالعے، فرضیوں کی تشکیل، سوالات کی ترتیب، حدود کا تعین، طریقۂ تحقیق کا انتخاب، موضوع کی تقسیم و ترتیب، ابواب بندی اور منابع و مآخذ کی فہرست سازی وغیرہ۔۔۔ ان کے بارے میں سکالرز کو محض بتا دینا کافی نہیں؛ عملی سرگرمی کی ضرورت ہے۔ اساتذہ اور سکالرز مل کر اس سرگرمی کو مفید اور ثمر آور بنا سکتے ہیں اور یقیناً اس سے اردو سندی تحقیق پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

حوالہ جات / حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: چوتھا باب بعنوان 'خاکہ'، ص ۱۰۶ تا ۱۳۸، گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۷ء

۲۔ دیکھیے مقالہ: موضوع کا انتخاب، از ڈاکٹر ش اختر، ص ۱۳۰ تا ۱۴۹، ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر (مرتب)، اردو میں اصول تحقیق (جلد اول)، ورڈ ویژن پبلشرز، اسلام آباد، طبع چہارم ۲۰۰۱ء

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء / رفاقت علی شاہد (مرتب)، تحقیق شناسی، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۴۔ عطش درانی، ڈاکٹر (مرتب)، اردو تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۵۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۶۔ اردو میں فرضیہ کے لیے مفروضہ کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے 'ادبی تحقیق کے اصول' میں یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کتاب میں 'مفروضہ کیا ہے؟' کے عنوان سے ایک باب دیا گیا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں: ''مفروضے کو ہم نصف نظریہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مفروضہ ابتدائی تحقیق کے نتیجے کے بعد وجود میں آتا ہے اور ابتدائی تحقیق میں کافی سوچ بچار کی بعد جب محقق واقعات و حقائق کا اچھی طرح جائزہ لے لیتا ہے اور اسے تحقیق کی ابتدائی شکل پر یقین اور اطمینان ہو جاتا ہے تو وہ پھر اپنے مفروضے کا اعلان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مفروضہ نصف نظریہ کہلا سکتا ہے۔ (ص ۵۴)۔۔۔ ''کیا ہر قسم کی تحقیق میں مفروضے کی ضرورت پڑتی ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جہاں تک اس تحقیق کا تعلق ہے کہ جو محض حقائق کی تلاش پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی مفروضے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کتب خانے کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست یا کسی موضوع پر کتابیات تیار کرنا، ان مسائل میں مفروضے کی

ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کی دوسری قسم میں کہ جو تنقیدی تشریح و توضیح کا کام کرتی ہے، مفروضے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر اچھے تحقیقی کام میں مفروضہ ضرور قائم کیا جاتا ہے تاکہ تحقیق کے بارے میں ایک نقطۂ نظر تشکیل پا سکے۔'' (ص ۵۶) باب کے مطالعے کے لیے دیکھیے: ص ۵۳ تا ۶۳

ڈاکٹر نثار احمد زبیری نے اپنی کتاب 'تحقیق کے طریقے' میں 'عملِ تحقیق' اور 'مفروضہ' کے عنوانات کے تحت مفید تفاصیل دی ہیں۔ ان کے نزدیک: ''ابتدا میں مفروضہ سوال کی شکل میں سامنے آتا ہے، ایسا ہے؟ یا ایسا نہیں ہے؟ رفتہ رفتہ متعلقہ مواد اور خصوصاً اپنے منتخب کردہ گوشے سے متعلق دوسروں کی تحقیق کے مطالعے سے مفروضے کے خد و خال واضح ہو جاتے ہیں اور محقق کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے دراصل کرنا کیا ہے۔ (ص، ۴۸)'' ۔۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر ایک طریقۂ تحقیق (Research method) میں مفروضہ قائم کرنا ضروری ہو۔ مثال کے طور پر تاریخی تحقیق (Historical Research) میں مفروضہ عام طور پر قائم نہیں کیا جاتا کیوں کہ اس طریقۂ تحقیق میں ماضی کے نامعلوم حقائق کو تلاش کیا جاتا ہے اور محض موضوع کے تعین سے ضروری رہنمائی میسر آجاتی ہے۔'' (ص، ۵۸۔۵۷) باب کے مطالعے کے لیے دیکھیے: ص ۵۵ تا ۶۹ (نثار احمد زبیری، ڈاکٹر، تحقیق کے طریقے، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۰ء)

مفروضہ کے بارے میں مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو: سید جمیل احمد رضوی، لائبریری سائنس اور اصولِ تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۷ء، صفحات ۹۷ تا ۱۱۶

۷۔ دستاویزی/ تاریخی تحقیق کی تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ادبی تحقیق کے اصول از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ص ۷۵ تا ۱۸۰ / تحقیق کے طریقے از ڈاکٹر نثار احمد زبیری، ص ۷۰ تا ۸۰/ لائبریری سائنس اور اصول تحقیق از سید جمیل احمد رضوی، ص ۱۱۷ تا ۱۵۸

۸۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ش اختر کی رائے ملاحظہ ہو: ''خاکہ میں ابواب کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے جس سے ربط و تسلسل کا پتہ چل سکے۔ اس تقسیم کی بنیاد اگر منطقی غور و فکر پر نہ ہو تو اسکالر مقالہ کی تحریری منزل میں بہت سی دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ ان تمام کمزوریوں

سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسکالر خاکہ کو آخری شکل دینے سے پہلے کئی بار نگران کی مدد سے نظر ثانی کرے۔ (موضوع کا انتخاب، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق، جلد اول، ص ۱۳۲)

۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، تحقیقی مقالات میں عنوان سازی، مطبوعہ: جرنل آف ریسرچ اردو، زکریا یونیورسٹی ملتان، شمارہ ۲۱، ۲۰۱۲ء، ص ۷۹ تا ۸۶

۱۰۔ یونس اگاسکر نے کتابیات اور فہرست مآخذ کی تیاری کو تحقیق کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک: 'تحقیق کا آغاز محض مطالعے کے نہیں، مطالعے اور مواد کے تعین سے ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے ببلیوگرافی یا کتابیات کی تیاری۔ دوسرے الفاظ میں فہرست مآخذات کی ترتیب، تحقیق کا اولین قدم ہوگا۔'' اس سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: یونس اگاسکر، ببلیوگرافی: تحقیق کا پہلا قدم، مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق (جلد دوم)، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۳ تا ۱۸۲

۱۱۔ تحقیقی خاکہ دراصل تحقیقی منصوبے کو منظم و مربوط کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی مفید ترین صورت وہی ہے جو اس مقصد کو پورا کرے۔ ڈاکٹر عطش درانی نے بجا لکھا ہے کہ: ''کسی فرد کی علمیت یا سکالرشپ کا زیادہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ تحقیق کار بھی بہت عمدہ ہے۔ تحقیق کی عمدگی کا انحصار اس کے لیے استعمال کی گئی دقت نظری پر ہے۔ اسی دقت نظری کی پیمائش ہمارے لیے تحقیقی ڈیزائین کی عمدگی اور درجے کو ظاہر کرے گی۔۔۔ آپ تحقیق کاری کا کوئی بھی خاکہ بنالیں اس سے تحقیقی سوالوں کا جواب ملنا چاہیے یعنی کیا وہ خاکہ فرضیوں کو مناسب طور پر جانچ سکتا ہے۔'' (اردو میں تحقیقی ڈیزائین کا جائزہ، مشمولہ: اردو تحقیق، ص ۱۱۹)

عنوان سازی کے قواعد اور طریقے

عنوان موضوع کا اظہاریہ ہوتا ہے۔ موضوع کے ارتکازی نکات، مرکزی اہداف اور بنیادی زاویے عنوان کے ذریعے اپنا اظہار پاتے ہیں۔ تحقیق میں عنوان محض ایک علامتی تختی نہیں اور نہ اس کی حیثیت ایسے اضافی نشان کی ہے جو تخیل، ذوق اور جمالیات جیسے مجرد ات کے تابع ہو۔ تحقیق میں عنوان ایک سوچا سمجھا اور عقلی بنیادوں پر ترتیب دیا گیا وہ اشاراتی پیکر ہے جو موضوع کی حدود و تفاصیل کے عین مطابق ہو۔ اس اشاراتی پیکر میں معنوی تقاضا ہر دوسری خصوصیت پر حاوی ہے اور یہ معنویت موضوع کے علائق کے ساتھ سائنسی و منطقی بنیادوں پر استوار و مربوط ہوتی ہے۔ تحقیق میں عنوان کے معاملے کو تخلیقی تحریروں کے عنوانات سے الگ و ممتاز کر کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تخلیق میں عام طور پر عنوان پہلے طے نہیں کیا جاتا اور اگر کیا بھی جاتا ہے تو اس میں یہ لچک ضرور ہوتی ہے کہ کسی بھی مرحلے پر اسے ایک دوسری صورت میں ڈھال لیا جائے۔ تخلیقی تحریروں کے عنوانات میں یہ بندش و قید نہیں ہوتی کہ عنوان لازماً موضوع کے عین مطابق ہو یا اس کی جزئیات پر دلالت کرے یا مرکزی خیال کو گرفت میں لائے۔۔۔ یہاں مصنف اپنے ذوق، احساس جمال اور تخیل کے مطابق کچھ بھی کر سکتا ہے اور اس پر کوئی قدغن اور حد بھی نہیں لگتی۔ فکشن اور نظمیہ شاعری کی روایت پر نظر کی جائے تو ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں تحریروں کے عنوانات اصل موضوع تحریر سے مربوط نہیں یا بہت دور کا واسطہ رکھتے ہیں۔ فکشن اور نظمیہ شاعری تو ایک طرف اردو کی قدیم علمی و تحقیقی کاوشوں پر نظر کی جائے تو ان میں سے اکثر کے عنوانات موضوع کی

طرف اشارہ کرنے یا اس کے اندراجات سے متعلق ہونے کے بجائے کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری کی اولین کڑی تذکرہ نگاری ہے۔ ان تذکروں میں چند ایک کے سوا باقی سب کے مرکزی عنوانات شاعرانہ اور اصل متن سے ہٹ کر ہیں۔ مثلاً خوش معرکۂ زیبا، گلشنِ بے خار، گلستانِ بے خزاں، ریاض الفصحا، سراپا سخن اور آب حیات وغیرہ۔ تذکروں کے بعد کے دورانیے میں، ماضی قریب اور فی زمانہ بھی علمی و تحقیقی منصوبوں کے لیے بعید از موضوع عنوانات کی مثالیں موجود ہیں۔ تاہم تحقیق کے جدید تقاضے اور اغراض و مقاصد اس روش پر حد لگاتے، تحقیقی اور تخلیقی عنوانات میں فرق و امتیاز قائم کرتے اور سائنسی بنیادوں اس معاملے کو زیر بحث لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اب تحقیقی تحریروں کے عنوانات میں من چاہی صورت انفرادی اور آزاد سطح پر تو شاید قابل قبول ہو لیکن پابند تحقیقی منصوبوں خاص طور جامعاتی سندی تحقیق میں قطعاً جائز و روا نہیں۔ سندی تحقیق میں کسی بھی منصوبے پر کام شروع کرنے سے پہلے اس کے اصل ہدف کے مطابق مرکزی عنوان اور تحقیق کے مختلف مراحل کو بیان کرتے ذیلی عنوانات طے کر لیے جاتے ہیں۔ یہ عنوان سازی کئی طرح کی احتیاطوں اور اصول و ضوابط کی متقاضی ہوتی ہے۔ اردو اصول تحقیق کی کتب میں تحقیقی موضوع کیا ہے اور اسے کیسا ہونا چاہیے پر تو تفصیلی بحثیں موجود ہیں لیکن عنوان سازی کے حوالے سے مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ (ا) تحقیقی مقالے کا عنوان کیسا ہونا چاہیے؟ اس کی بُنت میں کن امور کو مدنظر رکھا جانا چاہیے؟ عنوان کی پیشکش کیسے ہو؟۔۔۔ یہ سوالات حل طلب ہیں۔ زیر نظر مقالے میں اردو سندی تحقیقی مقالات کی عنوان سازی کے حوالے سے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذیل کی تفاصیل اسی ضمن میں ہیں۔

ا۔ تحقیقی مقالے کے عنوان کا براہ راست موضوع سے وابستہ ہونا ایک بنیادی شرط ہے۔ دیگر تحریروں میں عنوان کی موضوع سے وابستگی ایک اصولی تقاضا تو ہوتی ہے لیکن اس

میں اتنی شدت اور غیر لچکداری کیفیت بہر حال نہیں پائی جاتی اور عنوان موضوع سے کسی قدر ادھر ادھر ہو بھی جائے تو بھی کام چل جاتا ہے۔ تحقیقی مقالہ چونکہ ایک منضبط بیانیہ ہوتا ہے اور اس میں حاصلات کی صحت ان نشانات اور حدود کے تابع ہوتی ہے جنہیں آغازِ کار میں نشان زد کیا جاتا ہے، اس لیے یہاں عنوان کا براہ راست حدودِ کار کے مطابق ہونا لازمی اور ضروری تقاضا ہے۔ (۲) دیکھا جانا چاہیے کہ کیا عنوان، تحقیق کے ہدفی نکتے یا موضوع کی حدود کا احاطہ کر رہا ہے؟ کیا عنوان علائقِ موضوع سے براہ راست وابستہ ہے؟ کیا اس میں غیر لچکداری پن ہے؟ کیا عنوان کی پڑھت موضوع کی نفسیات پر دلالت کرتی ہے؟ ان سوالوں کے مثبت جواب تحقیقی عنوان کے موزونیت کے ضمن میں از بس ضروری ہیں۔ ایک قسم کی موضوعاتی حدود کے لیے عنوان طے کرتے وقت عام طور پر زبان میں ایک سے زیادہ امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہترین امکان وہی ہو گا جس میں موضوع سے براہ راست جڑت کی خوبی ہوگی۔

۲۔ تحقیقی مقالے کے عنوان کی ساخت متعلقہ زبان کے نحوی اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہاں زبان کے طے شدہ نحوی ضوابط سے انحراف کی گنجائش نہیں۔ (۳) تحقیقی عنوان موضوع سے متعلق کلیدی نشانات پر مشتمل الفاظ کا مرکب ہے۔ یہ مرکب کسی صورت بھی سوالیہ، فجائیہ یا سادہ یا پیچ دار مکمل جملے کی صورت میں نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ صوری حسن اور آرائش، تخلیقی عنوانات کی ایک بڑی خوبی لیکن تحقیقی عنوانات کے لیے خامی ہے۔ یہاں الفاظ کے چناؤ کا معیار خوبصورتی، دبازت، تاریخی پر اسراریت، روایت کی عطا کردہ چاشنی، یا تجدد کی لذت و حیرت نہیں بلکہ چناؤ کا واحد معیار موضوع سے مناسبت اور معنوی شفافیت ہے۔ ہر زبان میں کسی موضوع سے متعلق الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ تحقیقی عنوان کے انتخاب میں ان میں سے صرف وہی لفظ آئے گا جو موضوع کے حوالے سے کلیدی حیثیت رکھتا ہو، اس میں ذو معنویت نہ ہو، پیچیدگی اور ابہام نہ ہو، رومانوی تہ داری نہ ہو، شاعرانہ شناخت نہ ہو، التباس و اشتباہ نہ ہو، عمومیت اور ہلکا پن نہ ہو۔ اس کے برعکس لازمی طور پر اس لفظ میں قطعیت، علمی دبازت اور معنوی شفافیت ہونی چاہیے۔

۴۔ طوالت کسی بھی قسم کے عنوان کے لیے ایک نقص ہے تاہم تحقیقی عنوان میں اس کی حیثیت خصوصی ہے۔ یہاں ایجاز و اختصار مطلوب اور ایک خوبی کے طور پر نمایاں ہے۔ لیکن ایسا ایجاز جو ابہام پیدا کرے، کی گنجائش نہیں۔ تحقیقی مقالے کے عنوان کو اس خوبی سے طے کیا جانا چاہیے کہ موضوع اور حدودِ کار کا ضروری اظہار ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ تحقیقی عنوان کوئی اضافی بیانیہ نہیں کہ جسے من چاہی صورت میں ترتیب دے لیا اور بوقت ضرورت تبدیل کر لیا جائے۔ یہ ایک تحقیقی منصوبے کا اظہاریہ ہوتا ہے۔ یہ وہ روک ہے جو تحقیقی اندراجات کو پابند رکھتی ہے۔ اپنی اس حیثیت میں عنوان کسی تحقیقی منصوبے کے لیے مغز اور اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عنوان کی بنت مختصر اور جامع ہونی چاہیے۔ طوالت غیر ضروری جوابدہی کا باعث بنتی ہے اور ارتکاز پیدا نہیں ہونے دیتی۔ تحقیقی منصوبے کا مجوزہ مرتکز مطالعہ، مرتکز عنوان ہی کی بدولت ممکن ہے۔ اور اگر عنوان مرتکز نہ ہو تو اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ مقالے میں ان خطوط سے ہٹنا پڑ جائے، جو مطلوب تھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتے کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جائے۔ فرض کریں کوئی سکالر پاکستان میں اردو افسانے کے حوالے سے کام کرنا چاہتا ہے اور اس کے خیال میں سماجی حوالوں سے اردو افسانے میں جو رویے اور رجحانات ملتے ہیں ان پر تحقیق ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اہم افسانہ نگاروں کا اس موضوع کی مناسبت سے تقابل بھی چاہتا ہے۔ پس اگر وہ اس منصوبے کو یہ عنوان دے ''پاکستان میں اردو افسانے میں سماجی رویے اور رجحانات اور اہم افسانہ نگاروں کا تقابل'' تو یقیناً یہ عنوان موضوع کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے، اس کی مواد سے مناسبت بھی ہے اور مکمل اظہار کی بدولت اس میں افادیت

کا پہلو بھی ہے۔ لیکن واضح طور پر اس میں اختصار و جامعیت کی کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اگر عنوان کو یوں کر لیا جائے: ”پاکستانی افسانہ اور سماج“ تو یقیناً عنوان میں اختصار تو آ گیا لیکن اس میں سے جامعیت گم ہو گئی۔ جامعیت دراصل وہ خوبی ہے جو ایسا اختصار پیدا کرے جس میں ابہام و تشنگی نہ ہو۔ پاکستانی افسانہ کہہ کر عنوان کو مختصر تو کر دیا گیا لیکن اس میں ابہام یہ کہ کیا یہاں مراد تمام پاکستانی زبانوں کا افسانہ ہے یا پاکستانیت کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ یا پاکستان میں لکھا گیا اردو افسانہ؟ ساتھ ہی ساتھ اس عنوان میں سماجی رویوں اور رجحانات کے قائم مقام کے طور پر تنہا لفظ سماج بھی کھٹکتا ہے۔ پس لازمی طور پر عنوان کو مختصر اور جامع بنانے کے لیے درج ذیل میں سے کسی ایک انداز میں لانا پڑے گا: i۔ پاکستانی اردو افسانے میں سماجی شعور۔۔ ii۔ پاکستانی اردو افسانے میں سماجی عناصر iii۔ پاکستانی اردو افسانے میں سماجی رویے اور رجحانات وغیرہ۔

۵۔ تحقیقی مقالے کے عنوان میں روایتی الفاظ کی تکرار نہیں ہونی چاہیے۔ طویل سندی مقالات میں کوئی بھی مقالہ تحقیق، تنقید اور تقابل کے بغیر مکمل تصور نہیں ہوتا۔ یہ ایک طرح سے ایم فل، پی ایچ ڈی کے مقالات کا لازمی جزو تصور کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عنوان میں ان کی تصریح غیر ضروری ہے۔ مثلاً ”پاکستانی اردو افسانے میں سماجی شعور: (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)“ یا ”پاکستانی اردو افسانے میں سماجی عناصر: تنقیدی و تقابلی مطالعہ“ عنوانات میں تحقیق، تنقید اور تقابل کے الفاظ بلا جواز ہیں۔ (سندی مقالات کی روایت میں یہ اضافے بہ تکرار ملتے ہیں اور اب بھی کئی جامعات میں ایسے ہی عنوانات کا دستور ہے۔)

٦۔ مقالے کے عنوان کی بنت میں اس بات کا دھیان لازم ہے کہ عنوان کی عبارت چست ہو۔ اس میں زوائد اور بھرتی کے الفاظ و حروف قطعی نہیں ہونے چاہییں۔ خصوصی طور پر حروف ربط، حروف جار اور حروف اضافت کا ضرورت سے زیادہ استعمال عنوان کو بوجھل اور ڈھیلا بنا دیتا ہے۔ عنوان کی چستی سے جہاں جاذبیت میں اضافہ ہوتا ہے وہاں مفہوم میں بھی شفافیت آتی ہے۔۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ”ڈاکٹر وزیر آغا کی علم و ادب کے حوالے سے خدمات کا تجزیاتی مطالعہ“۔۔ اس عنوان میں ”کے حوالے سے“ اور ”کا تجزیاتی مطالعہ“ تبدیلی کے متقاضی ہیں۔ مناسب عنوان یوں ہوگا: ”ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات“۔۔ اسی طرح ”سلسلہ چشتیہ اور اس کی علمی و ادبی خدمات کا تعارف و تجزیہ“۔۔ اس عنوان میں ”اور اس“، ”کا“ اضافی ہیں۔ اور ”تعارف و تجزیہ“ کی صورت و نشست تبدیلی چاہتی ہے۔ مناسب عنوان یوں ہوگا۔ ”سلسلۂ چشتیہ کی علمی و ادبی خدمات“ یا ”سلسلۂ چشتیہ کی علمی ادبی خدمات: تحقیق و تجزیہ“

۷۔ یہ بات قطعی ہے کہ تحقیقی مقالے کا عنوان شاعرانہ نہ ہو۔ شعر، مصرع یا اس کا کوئی ٹکڑا تحقیقی مقالے کا عنوان نہیں بن سکتا۔ اسی طرح شاعرانہ وسائل کے عنوان میں استعمال کی بھی ممانعت ہے۔ بعض سکالرز عنوان میں اچھوتا پن یا جاذبیت یا چونکا دینے کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے یہ غلطی کرتے ہیں۔ خاص طور پر مختصر مقالات میں سکہ بند محققین کے ہاں بھی یہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے قطعی اجتناب لازم ہے۔

۸۔ عنوان میں اصطلاحات، اختصارات اور اسماء و متعلقات کا استعمال مناسب طریق پر ہونا چاہیے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ عنوان میں ان امور کے حوالے سے بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ نتیجتاً پیچیدگی، بے سمتی اور مضحک صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ’شعور کی رو‘ کو ’شعوری رو‘، روزنامہ ’زمیندار‘ کو صرف زمیندار، میر تقی میر کو صرف میر، ’شعری متن‘ کو ’شاعرانہ متن‘، ’انشائیہ نگاری‘ کو ’انشائی ادب‘، ’تانیثیت‘ کو ’نسوانیت‘ لکھنا وغیرہ۔

۹۔ دقیق و ناموس الفاظ عنوان کی بنت میں نقص کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے الفاظ سے گریز لازم ہے جو رائج ہونے کے باوجود تفہیم میں دقت کا باعث بنتے ہوں۔ بہتر ہے ان کے متبادلات استعمال کیے جائیں۔ اسی طرح طویل سندی مقالات کے عنوان میں ایک

تعارف، ایک جائزہ، چند، مختصر اور سرسری جیسے الفاظ سے بھی گریز لازم ہے۔

۱۰۔ مقالے کے عنوان کی طرح ابواب کے عنوانات طے کرتے وقت بھی اصول وضوابط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ابواب بندی میں من مانے طریقے اپنا لیے جاتے ہیں جس سے عدم توازن، غیر سنجیدگی اور بعض صورتوں میں بے معنویت جنم لیتی ہے۔ مقالے کی ابواب بندی میں بھی قبل ازیں بیان کردہ اصول وضوابط پیش نظر رہنے چاہییں تاہم اس ضمن میں کچھ دیگر نکات بھی ہیں۔ ضروری ہے کہ ہر باب مرکزی و ذیلی عنوانات میں تقسیم ہو۔ مرکزی عنوان کی عبارت اس خوبی سے طے کی جانی چاہیے کہ اس میں عمومیت بھی ہو اور باب میں زیر بحث نکات کی طرف اشارہ بھی نکلے۔ ذیلی عنوانات مرکزی عنوان سے جڑے ہوئے اور بحث کے مختلف زاویوں کی نشاندہی کرنے والے ہونے چاہییں۔ ایک باب میں زیادہ سے زیادہ پانچ زمروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ عام طور پر فہرست کو طول دینے یا بحث کے پھیلاؤ کی دھاک بٹھانے کے لیے ذیلی عنوانات کے طور پر بیسیوں چھوٹے چھوٹے اشارات دے دیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ شفافیت، آسانی اور افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ ہر باب میں کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ پانچ زمرے بنائے جائیں اور عنوانات کو ان کے مطابق طے کیا جائے۔

۱۱۔ ابواب کے عنوانات کا تعین تحقیق کی نوعیت کے مطابق ہوگا۔ سوانحی تحقیق میں سوانح، شخصیت، خدمات اور کارناموں کے مطابق ابواب اور ان کے عنوانات قائم کیے جائیں گے۔ موضوعی تحقیق میں مسئلہ زیرِ بحث کا پس منظری مطالعہ، اس کی حدود کا تعین، متعلقات اور تدریجی پھیلاؤ کو مدنظر رکھا جائے گا۔ متنی تحقیق میں ابواب اور عنوانات کی صورت بالکل مختلف ہوگی۔ یہاں اکثر اوقات طے شدہ مراحلِ تحقیق اور ان کے مختصر نشانات ہی باب کے عنوان کے طور پر کافی ہوتے ہیں۔ مثلاً مقدمہ، تدوین متن، حواشی، تعلیقات اور ضمائم وغیرہ۔

۱۲۔ ابواب کے عنوانات کی ترتیب و پیشکش میں ہندسوں کے بجائے ابجدی علامات استعمال کی جانی چاہییں۔ اس سے صوری حسن میں اضافے کے ساتھ ترتیب میں آسانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ مرکزی اور ذیلی عنوانات کے آخر میں ختمہ کی علامت نہیں لگانی چاہیے کیونکہ یہ جملے کی اختتامی علامت ہے اور عنوان یقیناً مکمل جملہ نہیں ہوتا۔ کسی بھی عنوان کو بلا ضرورت توڑ کر نہیں لکھنا چاہیے اس سے پیشکش کا جمالیاتی پہلو متاثر ہوتا ہے۔ عنوانات کے آخر میں ختمہ کی طرح رابطہ اور تفصیلیہ کی علامات بھی نہیں لگانی چاہییں تاہم درمیان میں ضرورت کے تحت رابطہ کی علامت لگائی جا سکتی ہے۔

تحقیقی مقالات کی عنوان سازی ایک سائنسی عمل ہے۔ یہ وجدان اور تخیل سے زیادہ عقل، تجربے اور مہارت کا رہینِ منت ہے۔ حزم و احتیاط، سوچ بچار اور حتمیت سے پہلے امکانات کی جانچ پرکھ اس عمل کے غیر لچکدار تقاضے ہیں۔ جس طرح موضوعِ تحقیق کے انتخاب کا مرحلہ کئی طرح کے سوالوں کے تابع ہے اسی طرح عنوانِ مقالہ اور ابواب کے عنوانات کا تعین و انتخاب منطقی اور واضح جواز چاہتا ہے۔ یہاں ہر لفظ، نشان اور حرکت و اضافت کے چناؤ کی جوابدہی ہے۔ اور یہی جوابدہی اور انتخاب کے جواز کا مطالبہ عنوان میں قطعیت، شفافیت اور معنویت لاتا ہے۔

حواشی

ا۔ اردو اصولِ تحقیق پر معروف تصنیف ''تحقیق کا فن'' از گیان چند، میں عنوان کی بحث کو 'اسلوب' کے ذیل میں محض ایک پیراگراف لکھ کر نپٹا دیا گیا ہے۔ مناسب ہوتا اگر اس پر تفصیلی بحث کی جاتی۔ اس پیراگراف میں عنوان کے حوالے سے جو گفتگو ملتی ہے اس کا انداز ملاحظہ ہو::

''مقالے کے اسلوب کی بحث کی شروعات ''عنوان'' سے کی جائے تو مناسب ہوگا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے ایک انگریزی مصنف لیرلی نے ہدایت کی ہے کہ مقالے کا عنوان بھڑک دار اور انشائیانہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ تحقیقی کتاب یا مضمون کا نام اس طرح کا ہونا چاہیے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اس کا موضوع تحقیق ہے، انشائیہ یا افسانہ نہیں۔ سب رس حیدر آباد میں ڈاکٹر زور کے دکنی ادب سے متعلق مضامین ''بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی'' کے عنوان سے نکلتے تھے جو نہایت نازیبا عنوان تھا۔ سب رس ہی میں وہ اور بعض دوسرے لکھنے والے دکنی ادب پر ''میٹھے بول سناؤں'' کے عنوان کے تحت لکھتے تھے۔ تحقیقی کتابوں کے نام ''چراغِ رہ گزر'' اور ''اشتر د سوزن'' بھی مناسب نہیں۔ چراغ رہ گزر شعری مجموعے کا نام معلوم ہوتا ہے اور اشتر د سوزن، اساطیری حکایتوں کے مجموعے کا۔'' (گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۴)

اس اندراج میں عنوان کے انشائی و افسانوی نہ ہونے پر زور ہے۔ بات لیرلی کے حوالے سے کی گئی اور بتایا گیا کہ پچھلے باب میں اس کا بیان لکھا گیا ہے۔ راقم نے پچھلا باب، بلکہ اس سے بھی پچھلا باب پڑھ لیا، کہیں لیرلی کا مذکورہ بیان نہیں ملتا۔ اردو اصول تحقیق کی دیگر کتب بھی عنوان کے مناسب اصول و مباحث کی پیشکش سے عاری ہیں، البتہ رسمیات تحقیق کی بعض کتب میں عنوان کے حوالے سے اندراج ملتا ہے۔ اس سلسلے میں اہم ڈاکٹر

معین الدین عقیل کا مرتبہ کتابچہ ''رسمیات مقالہ نگاری'' ہے جس میں صفحہ ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ پر عنوان کے ضمن میں چند نکات دیے گئے ہیں۔ ان کا اختصار کچھ یوں ہے:

''اگرچہ عنوان راست تحقیق کے ذیل میں نہیں آتا اور رسمیات کا اطلاق اس پر لازم نہیں لیکن اس سے مقالہ نگار کے تحقیقی مزاج اور تجزیاتی و تنقیدی ذہن کا اظہار ہوتا ہے۔ لہذا اسے جامع اور معنویت کا حامل ہونا چاہیے اور مناسب ہے کہ یہ غیر ضروری الفاظ اور طوالت سے پاک، مختصر اور جاذب توجہ ہو۔ اردو میں بالعموم عنوان کی جاذبیت کے لیے اس کی معنویت کی مناسبت سے الفاظ کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب یا بندش کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جاتی۔''

''عنوان میں قدیم اور روایتی انداز کے بجائے حروف جار اور حروف ربط سے گریز کر کے زیادہ جامعیت اور اختصار پیدا کیا جا سکتا ہے، جب کہ معنویت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''عنوان کے انتخاب میں اختصار اور الفاظ کا جامع و بامعنی استعمال بڑی اہمیت اور کشش رکھتا ہے اور عنوان کی جاذبیت ہی مقالے کو قابل توجہ بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں ذیلی عنوان کو قوسین میں لکھنے کا عام رجحان ملتا ہے، جب کہ قوسین کا استعمال عنوان میں غیر ضروری اور بلا جواز ہو سکتا ہے۔''

(معین الدین عقیل، ڈاکٹر، رسمیات مقالہ نگاری، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، کراچی، مارچ ۲۰۰۹ء)

۲۔ حدودِ کار میں تحقیق کا ارتکازی دائرہ، صنف، زبان، عہد اور علاقہ جیسے نکات اہم ہیں۔ مثلاً ''پاکستانی ناولوں میں مذہبی شعور''۔ اس عنوان میں زبان اور عہد کا تعین تشنہ ہے۔ فوری طور پر دو سوال ابھرتے ہیں: کیا یہاں مراد پاکستانی علاقائی زبانوں کے ناول ہیں؟ کیا یہاں مراد آغاز تا حال پاکستانی ناول ہیں؟ تشنگی کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ عنوان میں تبدیلی کی جائے۔ یہ تبدیلی کچھ یوں ہو گی: ''پاکستانی اردو ناولوں میں مذہبی شعور (آغاز تا حال)''

۳۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سکالرز عنوان بناتے وقت اردو زبان کے نحوی ضوابط سے انحراف کرتے ہیں۔ مثلاً ''اردو ماہیہ: پاکستان میں'' نحوی اعتبار سے درست نہیں۔ اسے

یوں ہونا چاہیے: ’’پاکستان میں اردو ماہیہ‘‘۔ اسی طرح عنوان ’’املا اور رسم الخط کے مباحث: اردو کے حوالے سے‘‘ بھی درست نحوی ترتیب میں نہیں۔ اسے یوں ہونا چاہیے: ’’اردو املا اور رسم الخط کے مباحث‘‘۔

تحقیقی مقالے کی زبان اور اسلوبیاتی شناختیں

تحقیقی مقالہ ایک ایسا منضبط بیانیہ ہوتا ہے جس میں لفظوں کا چناؤ، مرکبات و اصطلاحات کی پیشکش، جملے کی ساخت، جملوں کا آپس میں ربط و انصرام، پیراگرافس کا تناسب اور حرکات، اوقاف و علامات کا مربوط اہتمام کچھ خاص شناختوں اور اصولوں کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ذاتی پسند و ناپسند، احساسِ جمال اور تخیل و وجدان کے شخصی رویے ممنوع اور عقلی و منطقی عناصر حاوی ہوتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تحقیقی مقالات میں اسلوب کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے بیشتر مقالات پیشکش کے اعتبار سے قابل قبول ہونے کے باوجود اسلوبیاتی سطح پر ناقص اور غیر معیاری قرار پاتے ہیں۔ اسلوب کے حوالے سے کم توجہی کسی بھی تحقیقی منصوبے کو بے رس، کھردرا اور مجہول بنا دیتی ہے۔ واضح رہنا چاہیے کہ تحقیق کے حقیقی ثمرات مناسب اور معیاری اسلوب سے بہت قریب سے وابستہ ہیں۔ تحقیقی بیانیہ جتنا مربوط، منضبط، دوٹوک اور واضح ہوگا اتنا ہی اس کی پڑھت و تفہیم میں شفافیت آئے گی۔ ایک معیاری تحقیقی بیانیہ کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے؟ اس کے ضروری لوازم کیا ہیں؟ کون سے اصول و ضوابط ہیں جن کو مدنظر رکھ کر تحقیقی بیانیے کی تشکیل کی جانی چاہیے؟ تحقیقی بیانیے کا اسلوب دیگر نثری اسالیب سے کیونکر مختلف ہوتا ہے؟ اس کے اوامر و نواہی کیا ہیں؟ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن پر بحث ضروری ہے۔ اردو اصول تحقیق کی بعض کتب میں اس حوالے سے اندراجات ملتے ہیں(۱) تاہم ایک وسیع تر مطالعے کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔ زیرنظر مقالہ اسی تناظر میں ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ

موضوع کے حوالے سے اہم نکات کونشان زد کیا جائے اور نئے زاویوں کی تشکیل وترتیب کے ساتھ پہلے موجود افکار ونکات کو بھی بہ اندازِ نو مطالعے کا حصہ بنایا جائے۔ بحث کی مرحلہ وار تفاصیل ذیل میں پیش ہیں:

۱۔ تحقیق مقالے کے اسلوب کا بنیادی لازمہ اس کا منطقی وسائنسی ہونا ہے۔ تحقیقی بیانیہ حقائق کی بازیافت کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ واضح ومتعینہ حدود کے ساتھ کسی نکتے کی کھوج کا عمل ہوتا ہے۔ پس اگر اس کھوج کے لیے تشکیل دیا جانے والا بیانیہ مدلل، دوٹوک اور اور عقلی بنیادوں پر استوار نہیں ہوگا تو اہداف مجہول ومبہم ہو جائیں گے۔ تحقیقی بیانیے میں منطقی اور سائنسی انداز موضوع سے براہ راست جڑت اور وابستگی سے آتا ہے۔ اس ضمن میں تحقیق کار کو احتیاط وتوازن کے ساتھ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں۔ موضوع کے حوالے سے اہم الفاظ ومرکبات اور اصطلاحات وغیرہ کا چناؤ اور مناسب استعمال اسلوب میں ایک خاص علمی مزاج کی تشکیل میں معاون بنتا ہے۔ غیر اہم اور موضوع سے دور کا واسطہ رکھنے والے الفاظ ومرکیات اور افعال واسماء کے استعمال سے گریز اسلوب میں منطقیت کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح جملے کی ساخت میں شفافیت اور حتمیت ہونی چاہیے۔ (۲) شکیہ، احتمالی اور شرطیہ انداز سے گریز کیا جانا چاہیے۔

۲۔ تحقیقی اسلوب کی ایک انفرادی جہت اس کا غیر افسانوی پن ہے۔ تحقیق میں کہانی بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا اور نہ اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ کسی نکتے کو افسانوی انداز میں پیش کیا جائے۔ داستانویت، رومانیت اور افسانویت کی نفی تحقیقی اسلوب کی لازمی شرط ہے۔ یہاں تخیل ووجدان سے کام لے کر پراسراریت پیدا کرنا یا علامتی تہہ داری لانا یا جذباتیت واثر انگیزی پیدا کرنا ممنوع ہے۔ تحقیقی بیانیے کا اصل ہدف کم سے کم، واضح اور شفاف الفاظ میں مدعا کی ترسیل ہے۔ یہ ترسیل کسی بھی قسم کے لوچ اور جذباتی عنصر سے عاری ہونی چاہیے۔

۳۔ افسانہ طرازی کے ساتھ تحقیقی اسلوب میں شعریت پر بھی قدغن ہے۔ شاعرانہ وسائل سے کام لے کر عبارت کو خوشنما بنانا، یا جا بجا مصرعے وشعر جڑنا تحقیقی بیانیے میں شدید نوعیت کا نقص ہے۔ یہاں انشا پردازی اور زور بیان یا عبارت کی آرائش وزیبائش سے زیادہ حقائق کی ترسیل مقصود ہوتی ہے اور ایسی تمام صورتیں جن کے استعمال سے اس ترسیلی بہاؤ میں رکاوٹ آئے، قطعی طور پر منع ہیں۔

۴۔ خطیبانہ اور ناصحانہ انداز تحقیقی اسلوب کے لیے سم قاتل ہے۔ تقریری لب ولہجہ، خطابت کی گھن گرج اور تبلیغ ونصیحت کا ولولہ تحقیقی بیانیے کو ناقص بنا دیتا ہے۔ مقفی، مسجع اور پرتکلف بیانیہ تحقیق میں ایک تکلیف کے سوا کچھ نہیں (۳)۔ اس سے مقالے کی قدر وقیمت کم ہو جاتی ہے اور اندراجات اپنی سمت برقرار نہیں رکھ پاتے۔

۵۔ تحقیقی مقالہ ایک سنجیدہ علمی پیشکش ہوتا ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی ظرافت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مزاحیہ وطنزیہ انداز یا غیر ضروری خوش طبعی وشگفتگی مقالے کے اسلوب کو مطلوبہ معیار سے دور لے جاتی ہے۔

٦۔ تحقیقی بیانیے میں اختصار وجامعیت ایک اہم اور بنیادی تقاضا ہے۔ غیر ضروری طوالت مقالے کو بوجھل بنا دیتی ہے اور حد سے بڑھا ہوا اختصار ابہام پیدا کرتا ہے۔ مقالہ نگار کو اس ضمن میں ایک ایسا توازن خلق کرنا ہوتا ہے جس میں وضاحت کا عمل افراط وتفریط کا شکار نہ ہو۔ مقالے میں یقینی طور پر بہت سے نکات کو متنوع زاویے سے دیکھنے دکھانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس کے لیے کسی قدر طویل بیانیہ بھی تشکیل دینا پڑتا ہے لیکن یہ طوالت بوجھ بننے سے پہلے اختتام پذیر ہو جانی چاہیے۔ بسا اوقات مقالہ نگار اختصار کی کوشش میں محض اشارات پر اکتفا کو اہم سمجھنے لگتا ہے جس کے نتیجے میں کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ تفاصیل سے گریز کی یہ صورت بھی قابل قبول نہیں۔ عبارت کی تشکیل میں اعتدال وتوازن کا حصول دراصل مسلسل مشق سے وابستہ ہے۔ یہ مشق ہی وہ ہنر بخشتی ہے جو فیصلہ کرتا

ہے کہ کون سا جملہ لکھنا ہے اور کون سا نہیں لکھنا؟ یا یہ کہ اپنے لکھے ہوئے میں سے کیا کاٹنا ہے اور کیا رہنے دینا ہے؟ مقالے کے اسلوب میں زندگی، شفافیت، زور اور روانی اختصار و جامعیت ہی کی بدولت آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحقیقی اسلوب کا اگر کوئی واحد معیار یا شناختی نشان متعین کرنا مقصود ہو تو اس کا عنوان یقینی طور پر اختصار و جامعیت ہی ہوگا۔

۷۔ تحقیقی مقالے کے اسلوب میں سلاست شرط نہیں لیکن ممکنہ حد تک لکھت میں یہ خوبی پیدا کی جانی چاہیے۔ یقیناً کسی بھی تحقیق میں ایک علمی متانت، وقار اور سنجیدگی اولین تقاضا ہے اور اس کے لیے متعلقہ علم و فن کی پیچیدگیاں اور باریکیاں بھی در آتی ہیں لیکن علمی وقار و وقعت کے حصول کے لیے دقت پر مائل ہو جانا بھی ایک خرابی ہے۔ ہنر تو یہ ہے کہ دقیق علمی و ادبی مسائل کو بھی ایک قابل فہم اور سلیس انداز میں بیان کیا جائے۔ یہاں سلیس و آسان سے مراد روزمرہ کی عوامی سلاست نہیں بلکہ علمی سلاست ہے۔ (۴)

۸۔ عام طور پر تحقیقی مقالات کے اسلوب میں یہ بڑی خرابی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اس میں فلاسفیکل انداز نہیں ہوتا۔ اعلیٰ سندی تحقیقی مقالات کے لیے لازم ہے کہ ان میں فلاسفیکل سٹائل تشکیل دیا جائے۔ فلاسفیکل سٹائل سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ باتوں کو الجھا دیا جائے یا دور کی کوڑی لائی جائے یا دقیق نکتوں کو مزید دقتوں اور پیچ در پیچ زاویوں میں موڑ دیا جائے۔ فلاسفیکل سٹائل مدعا کو تدریجاً بیان کرنے، مرحلہ وار کسی نکتے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے اور بیان کو کڑی در کڑی جوڑے رکھنے کا نام ہے۔ یہ بکھرے ہوئے بیانیے کے مقابلے میں ایک منضبط بیانیے اور مدلل علمی انداز کی پیشکش ہے۔ مقالے میں موضوع سے متعلق سوالات، نکات اور مباحث کو مربوط و منطقی بیانیے میں ڈھالنا، عمومی و تشریحی بیانات کو علمی سیاق و سباق میں لانا اور مقالے کے متفرق و متنوع اندراجات کو متعینہ تناظر میں رکھنا۔ فلاسفیکل سٹائل کے واضح نشانات ہیں۔

۹۔ جملے کی ساخت، ایک جملے کا دوسرے جملے سے ربط اور جملوں کا وسیع تر انصرام تحقیقی

مقالے کے اسلوب میں توجہ طلب ہوتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جملے کی ساخت کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا، جملے بے ربط اور ڈھیلے ہوتے ہیں، نحوی اغلاط کی بھرمار ہوتی ہے، جملوں کی آپس کی جڑت میں خلا ہوتا ہے، افعال و اسماء اور صفات کو درست طور پر استعمال نہیں کیا جاتا، جملے میں بنیادی لفظ یا الفاظ کے سٹریس (زور/دباؤ) پر توجہ نہیں دی جاتی، ترادفات و تضادات کا برمحل استعمال نہیں ہوتا اور اصطلاحات کے استعمال میں بے احتیاطی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے مسائل اسلوب کو جھاڑ جھنکار بنا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک بڑی اور فاش غلطی تکرار کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ تکرار اگر متناسب اور محدود ہو تو یہ بیانیے میں زور اور وضاحت لاتی ہے، اس سطح پر یہ ایک خوبی ہے۔ لیکن حد سے بڑھی ہوئی تکرار ایسی خامی ہے جو اسلوب کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی بیڑہ غرق کر دیتی ہے۔ تکرار اور جملوں کی بنت میں کجی کبھی مطالعے کی کمی کے سبب آتی ہے اور کبھی لکھنے کی مشق نہ ہونے باعث۔ ہر دو صورتوں میں مقالے کا اسلوب شدت سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۰۔ تحقیقی مقالے کے اسلوب میں الفاظ کی صحت اور قطعیت ایک اہم نکتہ ہے۔ لکھنے سے پہلے یہ غور کر لینا چاہیے کہ کیا لفظ مناسب ہے؟ کیا لفظ درست ہے؟ لفظ کے اصل ہجے کیا ہیں؟ لفظ کی کامل صورت کیا ہے؟ لفظ اگر اصطلاح ہے تو کیا اس کا استعمال حدود و شرائط کے مطابق ہے؟ لفظ اگر اسم ہے تو کیا اس میں ابہام و تخفیف تو نہیں؟ لفظ فرسودہ و متروک تو نہیں؟ مروج ہے تو کیا اس کا تلفظ و املا معیاری ہے؟ لفظ مہمل و خود ساختہ تو نہیں؟ مخفف ہے تو کیا اس کی تعبیر و تشریح کی ضرورت ہے یا اس کا چلن عام ہے؟ وغیرہ۔ ان سوالوں کو مدنظر رکھ کر اسلوب میں شستگی اور حتمیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ سندی مقالات کو چونکہ آئندہ تحقیق کی بنیاد بننا ہوتا ہے اس لیے ان کے متن میں لفظوں کی صحت و درستی ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

۱۱۔ سندی تحقیقی مقالات میں جانبداری اور عقیدت کئی طرح کے اضافات کا باعث بنتی ہے۔ تعریفی و توصیفی جملے، القاب و آداب، جا و بے جا جانبدارانہ تفاصیل و مباحث، پرکشش

الفاظ وتراکیب، مبالغہ آمیزی اور صفات کی انتہائی صورتیں وغیرہ اس رویے کی بدولت اسلوب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مقالے کے مواد واسلوب میں اس قسم کی آمیزش سختی کے ساتھ ممنوع ہے۔ بسا اوقات یہ آمیزش لاعلمی اور عدم مشق کی بدولت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ ضروری ہے کہ شعوری کوشش کے ساتھ اس قسم کے اندراجات سے بچا جائے۔ بصورت دیگر مقالے کا اسلوب متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی بے راہ روی کا شکار ہو جائے گی۔

۱۲۔ اردو زبان میں چونکہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور مختلف زمانوں میں اردو بول چال اور تحریر کی زبان پر متعدد زبانوں کا غلبہ رہا ہے اس لیے تحقیقی مقالات میں یہ لازم ہے کہ اردو کے عصری استعمالات کو ترجیح دی جائے۔ اس میں بھی تناسب واعتدال کے ساتھ معیاری چلن کو بنیاد بنایا جائے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ تحقیق کار اپنے مزاج یا علمی استعداد کی مناسبت سے عربی، فارسی یا انگریزی کو اس بے احتیاطی سے مقالے میں گھسیڑ دیتے ہیں کہ اردو کی اردویت برائے نام رہ جاتی ہے۔ سندی تحقیقی مقالات کے اسلوب میں اس قسم کی صورتحال قابل قبول نہیں ہوتی۔ یقیناً بعض موضوعات کے بیان میں دیگر زبانوں کے الفاظ واصطلاحات کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ایک ناگزیر عمل ہے لیکن اس میں اعتدال وتوازن کا التزام لازم ہے۔

تحقیقی مقالات کے اسلوب کے حوالے سے ان اندراجات کو مدنظر رکھ کر کوئی تحقیق کار نہ صرف اپنی تحقیق کی سمت متعین کر سکتا ہے بلکہ ایک بہتر، معیاری اور قابل قبول بیانیہ بھی تشکیل دے سکتا ہے۔ تحقیقی بیانیے کی صحت و درستی فی الاصل تحقیق کی صحت و درستی ہے۔ پس ضروری ہے کہ تحقیقی بیانیے کی تشکیل سے پہلے اس کے اسلوبی لوازم، تقاضوں اور شناختوں سے آگاہی حاصل کی جائے اور دوران تحقیق ان کو ملحوظ رکھا جائے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر گیان چند نے ''تحقیق کا فن'' میں 'زبان و بیان' کے عنوان سے ایک پورا باب دیا ہے۔ اس میں الفاظ کی قطعیت، مخففات، اصطلاحوں اور جارگن کے حوالے سے محققین کی آراء بیان کی گئی ہیں۔ تحقیقی مقالے کے اسلوب پر کئی مشرقی ومغربی ماہرین کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ مشرقی محققین کی تحقیق میں سے مثالیں دی گئی ہیں اور ان کا محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ تاہم واضح اور حتمی انداز میں ان کی اپنی رائے پس منظر میں ہی رہتی ہے۔ متضاد ومتصادم آراء کا ہجوم بغیر کسی فیصلے کے ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو: تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۸ تا ۲۶۹

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے ایک مضمون ''ادبی تحقیق کے لیے معیاری زبان'' میں ''تحقیق کا فن'' اور ''The Art of Literary Research'' سے ماخوذ اہم نکات کا خلاصہ دیا ہے۔ تحقیقی مقالات کے اسلوب کے حوالے سے یہ اندراج ملاحظہ ہو:

''i۔ تحقیق کی زبان کو واضح، غیر مبہم اور براہ راست ہونا چاہیے۔

ii۔ نامانوس یا نیم نامانوس اصطلاحات کی فرہنگ یا توضیح مقالے یا کتاب میں شامل ہونی چاہیے۔

iii۔ مخففات کو استعمال کرنا ناگزیر ہو تو اس کی فہرست ابتدا میں دے دی جائے، اس کے لیے معروف طریق کار ہی کی پیروی کی جائے نہ کہ اپنی ایسی اختراعی صلاحیت کا اظہار کیا جائے، جو نجی یا شخصی ہو۔

iv۔ عبارت کو طویل اقتباسات، جملہ ہائے معترضہ اور حوالوں کے انبار سے بچانا چاہیے۔

v۔ بہت ضروری ہو تو اپنے لیے ضمیر متکلم کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے وگرنہ ہم یا راقم السطور کی تکرار تحقیقی مقالے میں سوانحی رنگ پیدا کر دیتی ہے۔

vi۔ تنقیدی اور تجزیاتی انداز ہونا چاہیے۔ خطابت کو استدلال کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔

vii۔ حتی الامکان اپنی فضیلت کو منوانے، اس میدان کے کسی اور مخصص کی تضحیک کرنے یا چونکانے کے آرزومند الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

viii۔ تعمیم اور رسمی توصیف کے مظہر، مبتذل ہو جانے والے کلمات کے استعمال سے پرہیز کرنی چاہیے۔

ix۔ عبارت میں غیر ضروری بھرتی اور مقالے کو ایک خاص حجم تک پہنچانے کی مصنوعی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے، آلنک تو کہتا ہے جو آپ کو کہنا ہے کہیں اور جب کہ چکیں تو پھر والسلام۔

x۔ مقالے کو خواندنی ہونا چاہیے، پڑھنے والے کو اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے یا اس کے ذخیرۂ الفاظ یا استعداد علمی کو سفاکی کے ساتھ نہیں آزمانا چاہیے۔" (مشمولہ: اردو تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، ص ۰۵۔۲۰۴)

اسلوبِ تحقیق کے حوالے سے چند دیگر کتب میں بھی اندراجات ملتے ہیں۔ دیکھیے: اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء/ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ / مبادیات تحقیق، عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی ۱۹۹۸ء/ اردو تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۲۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنے ایک مقالے میں اس ضمن میں لکھتے ہیں: "دلچسپی اس کا جوہر نہیں۔ نہ دلکشی کی میزان پر اسے پرکھا جانا چاہیے۔ اس کا رخ آرٹ سے زیادہ سائنس اور فلسفے کی طرف ہوتا ہے۔ جہاں الفاظ حتی الامکان پوری احتیاط اور تعین معانی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔" مشمولہ کتب محولہ۔

۳۔ تحقیقی مقالے کے اسلوب میں افسانہ طرازی، خطابت، مبالغہ اور لفاظی سے گریز کے حوالے چند محققین کی آراء ملاحظہ ہوں: "محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے، آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ تناقص و تضاد اور ضعف استدلال سے بچنا چاہیے اور مبالغہ کو تحقیق کے لیے سم قاتل سمجھنا چاہیے۔" (قاضی عبدالودود) "تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے

پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اردو میں تنقید جس طرح انشا پردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔" (رشید حسن خان) "تحقیقی مقالہ چونکہ واقعات و حقائق پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس میں لفاظی یا افسانہ طرازی، خطابات یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ باتیں مقالے کی عظمت کو کم کرتی ہیں۔" (عبدالرزاق قریشی) مزید دیکھیے کتب محولہ۔

۴۔ ڈاکٹر عطش درانی کے نزدیک: "تخلیق کار تو صنائع لفظی و معنوی، علامتی اظہار، جذباتی طرز استدلال اور ابہام وغیرہ کے استعمال سے تحریر کو پرکشش بنا سکتا ہے مگر تحقیق کار کو حقائق کی تنی رسی پر احتیاط سے چلنا ہوتا ہے۔ لہذا اسے شگفتگی اور رنگینی کو فراموش کرنا ہوگا۔ تحقیق کار کو اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ اس کا منشا چونکہ حقائق رسانی ہے لہذا اسے محتاط رہنا ہوگا کہ اس کے اظہار اور ابلاغ میں کوئی فاصلہ نہ رہے۔ اور اس کا نقطۂ نظر قاری کے ذہن تک کسی جھٹکے کے بغیر منتقل ہو۔ اس دیکھ بھال کے باوجود وہ شگفتگی کو بھی برقرار رکھتا ہے تو یہی وہ پل صراط ہے۔ جہاں سے بھرپور مشق و مہارت کے بغیر گزرنا مشکل ہے۔" (جدید رسمیات تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء)

ماخذ کے اندراج کے قواعد اور طریقے

تحقیقی منصوبہ جات میں ماخذ کی نشاندہی ایک ضروری تقاضا ہے۔ اس سے نہ صرف مواد کی صحت و درستی کا تعین آسان ہو جاتا ہے بلکہ تلاش و جستجو کے اس سفر کی عکاسی بھی ہوتی ہے جو تحقیق کار نے دورانِ تحقیق گوارا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ زیرِ بحث موضوع پر اور اس سے متعلق، قدیم و جدید مواد بھی ایک ترتیب میں سامنے آ جاتا ہے۔ تحقیق کے عمل میں ماخذ کی نشاندہی پر تو اہل اردو میں یقیناً کوئی اختلاف نہیں لیکن ماخذ کی نشست و پیشکش پر اختلافات طولانی ہیں۔ اردو تحقیق کے قدیم نمونوں میں یہ معاملہ زیادہ ترشخصی ہونے کی وجہ سے باعثِ نزاع نہ تھا لیکن جب سے جامعاتی سطح پر اردو تحقیق منظّم ہوئی ہے۔۔۔ یہ معاملہ اہم اور متنازع بن گیا ہے۔ قومی سطح پر اس سلسلے میں کوئی طے شدہ ضابطہ نہ ہونے کے باعث جامعات میں بالخصوص اور غیر جامعاتی سطح پر بالعموم، ایک انتشاری کیفیت نمایاں ہے۔ اگرچہ بعض علمی و تحقیقی اداروں، جامعات، اور مقتدر علمی شخصیات کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں رہنما اصول تجویز کیے جاتے رہے ہیں(ا) لیکن کوئی متفقہ لائحہ عمل ہنوز سامنے نہیں آ سکا۔ ضروری ہے کہ اس بحث میں مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے حل کی طرف بڑھا جائے۔ ذیل کی تفاصیل اسی ضمن میں ہیں:

اردو سندی تحقیقی مقالات میں ماخذ کی نشاندہی کے حوالے سے مسائل و مباحث دو بڑے زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

i۔ ماخذ کی نشست

ii۔ ماخذ کی پیشکش

i۔ ماخذ کی نشست:

ماخذ کے نشست کے حوالے سے درج ذیل چار نکات تسلسل کے ساتھ زیر بحث آتے ہیں:

ا۔ ماخذ کی نشاندہی بین المتن ہو

۲۔ پاورقی ہو

۳۔ ہر باب کے آخر میں ہو

۴۔ تمام ابواب کے آخر میں ہو۔

بظاہر یہ چاروں صورتیں قابل عمل ہیں اور ہر ایک کی بابت افادیت کے کچھ پہلو بیان کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ نقائص پر بھی نظر رکھی جائے۔ اس سلسلے میں بنیادی اور اہم نکتہ متن کی روانی ہے۔ ماخذ کے اندراج کی ایسی تمام صورتیں جو متن کی روانی میں خلل ڈالیں، قابل قبول نہیں ہونی چاہییں۔ دوسری اہم بات ماخذ کی تفاصیل تک بسہولت رسائی ہے۔ تمام ابواب کے آخر میں اندراج اس ضمن میں پیچیدگی کا باعث بنتا ہے۔ متوازن اور قدرے مفید صورت ہر باب کے آخر میں ماخذ کا اندراج ہے۔ فی زمانہ اسی صورت کو علمی و تحقیقی مقالات میں پذیرائی حاصل ہے لیکن یہ متفق علیہ نہیں۔ بعض اصحاب پاورقی حواشی و حوالہ جات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ یہ اختلاف رائے دراصل تحقیق کی نوعیت میں فرق روا نہ رکھنے کے باعث ہے۔ موضوعی و سوانحی تحقیق کو اگر ایک زمرہ اور متنی تحقیق کو زمرہ ثانی قرار دیا جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ متنی تحقیق میں افادہ اور سہولت یقیناً پاورقی حواشی ہی میں ہے لیکن اس کا اطلاق موضوعی و سوانحی تحقیق پر نہیں ہونا چاہیے۔ ضروری ہے کہ ہر دو زمرہ جات میں ماخذ کی نشست؛ سہولت اور آسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف انداز سے ہو۔ یہاں ایک قضیہ بنیادی اور ثانوی ماخذ کے اندراج کا بھی ہے۔ یہ تجویز بہ تکرار ملتی ہے کہ بنیادی

مآخذ بین المتن قوسین میں مختصراً لکھے جائیں اور ثانوی ہر باب کے آخر میں۔ یہ تجویز مناسب اور قابل عمل ہے لیکن اس صراحت کے ساتھ کہ یہ طریق صرف اس وقت اختیار کیا جائے جب تحقیق میں مسلسل و متواتر بنیادی مآخذ کا اندراج ناگزیر ہو۔ دیگر تمام امکانی صورتوں میں مآخذ ہر باب کے آخر میں درج کیے جانے چاہییں۔

ii۔ مآخذ کی پیشکش:

مآخذ کی پیشکش میں مسائل و مباحث کا محور درج ذیل پانچ اجزاء ہیں: مصنف کا نام۔ ماخذ کا نام۔ مطبع و مقام اشاعت۔ سن اشاعت۔ صفحہ نمبر۔

i۔ مصنف کا نام:

ایسے مآخذ جو منسوب بہ اشخاص ہوں ان کے اندراج میں اولیں سطح پر شخص کا نام اور اس کی ماخذ سے نسبت واضح کرنا بنیادی شرط ہے۔ یہاں بنیادی مسئلہ نام کیسے لکھا جائے ہے۔ بعض اصحابِ علم کی تجویز ہے کہ انگریزی طرز پر نام کا آخری جز پہلے اور پہلا جز بعد میں درج کیا جائے۔ اردو میں اس طریقہ کار کو اپنایا جائے تو بیشتر ناموں کی شناخت مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً سر سید احمد خاں کو اگر یوں لکھا جائے: خاں، سید احمد، سر۔۔ یا شبلی نعمانی کو لکھا جائے: نعمانی، شبلی۔۔ رشید امجد کو لکھا جائے: امجد، رشید۔۔ گوہر نوشاہی کو لکھا جائے: نوشاہی، گوہر۔۔ تو یہ مضحکہ خیز ہوگا۔ (۲) دیکھنا چاہیے کہ نام کا اندراج کس مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔۔ یقیناً شناخت کے لیے۔ تو لازم ہے کہ پہلے نام کا وہ حصہ درج کیا جائے جو اس مقصد کو پورا کرے۔ یہ شناختی جز مفرد بھی ہو سکتا ہے اور مرکب بھی۔ مرکب ہونے کی صورت میں اسے توڑا نہ جائے۔ مثلاً جالبی، جمیل، ڈاکٹر نہیں بلکہ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر نہیں بلکہ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر۔۔ ملک، فتح محمد، پروفیسر نہیں بلکہ فتح محمد ملک، پروفیسر۔۔ وغیرہ لکھا جائے۔ خطابات و القابات اور عہدہ و منصب کو اسی اصول کے تحت نام کے بعد جگہ دی جائے۔ تخلص ہمارے ہاں مقبول شناختی علامت ہے پس اسے پہلے اور بعد میں پورا نام دیا جائے۔ تخلص لکھنے کے بعد نام کو توڑا نہ جائے۔ مثلاً آزاد، محمد حسین، مولانا۔۔ سودا، محمد رفیع۔۔ غالب، اسد اللہ۔۔ اقبال، محمد اقبال۔۔ وغیرہ لکھا جائے۔ ماخذ سے شخص کی نسبت ظاہر کرنا بھی اس زمرے میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں تجویز ہے کہ نسبت کی نشست نام کے فوراً بعد ہو اور اس کے اول و آخر چھوٹی قوسین لگائی جائیں۔ اگر نسبت 'مصنف' ہو تو ظاہر نہ کی جائے۔ لیکن مرتب، مؤلف، مدون اور مترجم جیسی نسبتیں ظاہر کی جائیں۔ مثلاً آصف فرخی، ڈاکٹر (مترجم)۔۔ وغیرہ۔

ii۔ ماخذ کا نام:

ماخذ کا نام بغیر حذف و اضافے کے مکمل صورت میں جیسا وہ ہے، ویسا لکھا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں دو رائے نہیں اور نہ کوئی اختلافی نکتہ ہے۔ تاہم یہ بحث ضرور ہے کہ ماخذ کے نام کو اکہرے واوین میں لکھا جائے، دوہرے واوین میں، یا اس کے اوپر لائین لگائی جائے، نیچے لائین لگائی جائے، یا اس کا فونٹ مختلف ہو؛ یعنی اگر باقی متن نستعلیق میں ہے تو ماخذ کا نام نسخ میں ہو، یا اسی فونٹ میں متعلقہ عبارت کو بولڈ کر دیا جائے وغیرہ۔۔ غور کیا جائے تو یہ تمام نکات سراسر تکلیف کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ آسانی یہی ہے کہ مصنف کے نام کے فوراً بعد زیریں کوما لگایا جائے، ماخذ کا نام لکھا جائے اور پھر زیریں کوما لگا کر دیگر تفاصیل دی جائیں۔ مثلاً: ناشاد، ارشد محمود، ڈاکٹر، اطرافِ تحقیق،۔۔ الخ۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصول تحقیق (جلد اول)،۔۔ الخ۔

iii۔ مطبع و مقام اشاعت:

مطبع و مقام اشاعت کا بیان، ماخذ کے بیان کے بعد ہونا چاہیے اور یہی مروج ہے۔ یہاں قابل غور نکتہ پریس اور ادارہ میں فرق روا رکھنا ہے۔ ایسے تمام مآخذ جو کسی ادارے / پبلشر کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہوں، ان پر اس ادارے / پبلشر ہی کا نام آئے گا، پریس کا نہیں۔ مثلاً نفیس اقبال، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو گیت نگاری، سنگ میل پبلی

کیشنز، لاہور۔۔۔جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، مجلس ترقی ادب، لاہور۔۔وغیرہ۔ اول الذکر کتاب آر آر پرنٹرز، لاہور سے چھپی ہے اور ثانی الذکر علی پرنٹرز، لاہور سے۔ کسی ماخذ پر ادارہ / پبلشر کا نام نہ ہونے کی صورت میں پرنٹر کا نام لکھا جانا چاہیے۔

iv۔ سن اشاعت:

حوالے کے اندراج میں سن اشاعت کی نشست، ادارہ و مقام کے بعد ہے۔ تاہم بعض اصحاب انگریزی طرز پر سن کا اندراج مصنف کے نام کے فوراً بعد اور بعض ماخذ کے فوراً بعد تجویز کرتے ہیں۔ دونوں طریقے مناسب نہیں۔ اس اندراج کی نوعیت کو سمجھا جائے تو معاملہ بہ آسانی حل ہو سکتا ہے۔ یہ اندراج ماخذ کی اشاعت کے سن کے تعین کے لیے ہے؛ ماخذ کے لکھے جانے یا خود مصنف کی ذات سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ پس اس کی نشست ادارہ و مقام اشاعت کے فوراً بعد ہے۔ یہ مروج بھی ہے اور اس میں سہولت و آسانی بھی ہے۔ یہ اندراج اردو ہندسوں میں ہونا چاہیے اور اس کے نیچے سن کی علامت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اول و آخر قوسین لگانا بھی غیر ضروری ہے۔

v۔ صفحہ نمبر:

سن اشاعت کے بعد صفحہ نمبر کا اندراج ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں یکساں طریقہ کار رواج دینے کے لیے ضروری ہے کہ صفحہ نمبر کا اندراج اردو ہندسوں میں ہو، اندراج سے پہلے صرف 'ص' کی علامت لگائی جائے؛ ایک سے زیادہ صفحات ہونے کی صورت میں 'ص ص' نہ لکھا جائے۔ 'تا' کا کلمہ بھی ہندسوں کے درمیان نہ لکھا جائے تو بہتر ہے۔ بائیں سے دائیں ڈیش ڈال کر 'تا' کی ضرورت کو پورا کیا جائے مثلاً: ص۲۳/ ص۲۲، ۲۳/ ص۵۵۔۴۴۰ وغیرہ۔ تاہم بوقت ضرورت 'تا' کے استعمال میں قباحت نہیں۔ خصوصاً جہاں صفحات کا درمیانی وقفہ زیادہ ہو مثلاً صفحات ۱۵ تا ۵۰، دیکھیے صفحہ ۱۳ تا ۴۸ وغیرہ۔

ماخذ کے اندراج کے حوالے سے ان امور کو مدنظر رکھ کر آسانی اور سہولت کے ساتھ کسی علمی و تحقیقی تحریر کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ نوعیت کا معاملہ ہے اور کیا ہی اچھا ہو اگر مختلف جامعات مل کر کسی پیٹرن پر اتفاق رائے قائم کر لیں۔ قومی سطح پر اس معاملے کو حل کیا جانا چاہیے لیکن سر دست اس کا امکان کم نظر آتا ہے۔۔۔ سندی تحقیق سے متعلق سکالرز کے لیے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وہ اپنی جامعہ کے اس سلسلے میں بیان کردہ قواعد کو ملحوظ رکھیں۔

ماخذ کی نشست و پیشکش سے متعلق درج بالا مباحث کے بعد ضروری ہے کہ کچھ اصول وضع کر کے ان کے مطابق ایک دستور العمل ترتیب دیا جائے۔ اردو تحقیق کے مزاج، مذاق، ضرورت اور موزونیت کو اس مرحلے میں مدنظر رکھا جانا ازبس ضروری ہے۔ ذیل کی تفاصیل اسی ضمن میں ہیں۔ تجاویز کو دو حصوں حوالہ جات اور کتابیات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے میں پہلے رہنما اصول دیے گئے ہیں اور بعد میں مجوزہ طریقۂ کار کا بیان ہے۔ (۳)

حصہ اول: حوالہ جات

حوالے کا اندراج: رہنما اصول

۱۔ حوالے کے اندراج میں صرف طے شدہ، مختصر تفاصیل ہونی چاہییں۔

۲۔ پہلی بار حوالہ مکمل صورت میں درج کرنا ہوگا۔

۳۔ دوسری بار صرف مصنف، تحریر کا عنوان اور ص نمبر کا اندراج ہوگا۔

۴۔ اگر حوالہ مسلسل ہے تو ایضاً لکھا جائے، اور صفحے کی تبدیلی درج کی جائے۔

۵۔ ناموں کو ان کی فطری ترتیب کے مطابق درج کیا جائے۔ مثلاً سید احمد، محمد حسین، محمد اقبال وغیرہ۔
غیر فطری ترتیب جس سے نام کی شناخت مسخ ہو جائے، کی سختی سے ممانعت ہے۔
مثلاً الطاف حسین کو حسین، الطاف۔ مطیع اللہ کو اللہ، مطیع۔ معین الدین کو الدین،

معین۔ گیان چند کو چند، گیان۔ ہرگز نہ لکھا جائے۔

۶۔ نام میں اگر تخلص موجود ہے تو پہلے تخلص درج کیا جائے۔ مثلاً آزاد، غالب، حالی وغیرہ۔

۷۔ نام میں خطاب و فضیلت کو نام کے بعد درج کیا جائے۔ مثلاً سر، ڈاکٹر، مولوی، مولانا، حافظ وغیرہ

۸۔ حوالے میں کہیں بھی اوپری اکہرے یا دوہرے واوین استعمال نہ کیے جائیں۔

۹۔ حوالے میں کسی کتاب یا مضمون کے نام کو انڈر یا اوور لائین نہ کیا جائے۔

۱۰۔ حوالے میں مضمون، نظم، فلیپ، دیباچے، مرتب، مترجم وغیرہ کی تخصیص کے لیے چھوٹی قوسین کا استعمال کیا جائے۔

۱۱۔ حوالے میں سنین کو اکٹھا لکھنے کی صورت یوں ہوگی: ۳۔۷۔۱۹۷۲ء

۱۲۔ حوالے میں ایک سے زیادہ صفحات کا اندراج یوں ہوگا: ص ۸۸۔۸۷

حوالے کا اندراج: مجوزہ طریقۂ کار

اس بحث کی درج ذیل نو تقسیمیں ہیں:

۱۔ کتب کا حوالہ
۲۔ رسائل و جرائد کا حوالہ
۳۔ انٹرویو کا حوالہ
۴۔ مکتوب کا حوالہ
۵۔ غیر مطبوعہ متون کا حوالہ
۶۔ انٹرنیٹ مواد کا حوالہ
۷۔ دستاویزات کا حوالہ
۸۔ بالواسطہ حوالہ
۹۔ حواشی / تعلیقات

۱۔ کتب کا حوالہ

اس حصے کی چار ذیلی تقسیمیں ہیں:

i۔ مصنفہ کتب ii۔ مرتبہ کتب iii۔ مدونہ کتب iv۔ مترجمہ کتب

i۔ مصنفہ کتب

پہلی صورت: ایک مصنف۔ ایک جلد۔ ایک اشاعت

ساخت: (مصنف کا نام، کتاب کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۰

دوسری صورت: ایک مصنف۔ دو یا دو سے زیادہ جلدیں۔ دو یا دو سے زیادہ اشاعتیں

ساخت: (مصنف کا نام، کتاب کا نام، جلد نمبر، اشاعتی ادارہ، مقام، اشاعت نمبر و سال، صفحہ نمبر)

نمونہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اول)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ہفتم ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۱

تیسری صورت: دو مصنف۔ ایک جلد۔ ایک اشاعت

ساخت: (مصنف ۱۔۲، کتاب کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: روش ندیم / صلاح الدین درویش، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵

چوتھی صورت: مصنفہ کتاب میں کسی ناقد کی رائے کا حوالہ

ساخت: (ناقد کا نام، نوعیت تحریر، کتاب کا نام، مصنف کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: آنند، ستیہ پال، (پس لفظ) غار میں بیٹھا شخص، از رفیق سندیلوی، کاغذی پیرہن، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۰

نمونہ ۲: وزیر آغا، ڈاکٹر، (فلیپ) غار میں بیٹھا شخص، ایضاً

پانچویں صورت: مصنفہ کتاب کا متن مختلف مضامین کی صورت میں ہو تو

ساخت: (مصنف کا نام، مضمون کا عنوان، تصریح، کتاب کا نام، ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: مہدی جعفر، ڈاکٹر، انور سجاد کے چند علامتی کردار، (مضمون) مشمولہ: نئے افسانے کی اور منزلیں، اصیلہ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص 115

ii۔ مرتبہ کتب

پہلی صورت: ایک مرتب۔ ایک جلد۔ ایک اشاعت

ساخت: (مرتب کا نام، تصریح، کتاب کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: نوشی انجم (مرتب)، سوال یہ ہے، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴ء، ص ۲

دوسری صورت: دو یا دو سے زیادہ مرتبین۔ ایک جلد۔ ایک اشاعت

ساخت: (مرتب کا نام ۱۔۲، تصریح، کتاب کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: قمر رئیس، ڈاکٹر/ عاشور کاظمی، سید (مرتبین)، ترقی پسند ادب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۲

تیسری صورت: مرتبہ کتاب میں سے کسی مضمون، تبصرہ، خاکہ، انشائیہ، نظم وغیرہ کا حوالہ

ساخت: (مصنف کا نام، تحریر کا عنوان، نوعیتِ تحریر، مرتبہ کتاب کا نام، مرتب / مرتبین کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ترقی پسند ادب کے محرکات ور جحانات، (مضمون) مشمولہ: ترقی پسند ادب، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس / سید عاشور کاظمی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۷۰

نمونہ ۲: حسرت، چراغ حسن، فلسفہ حیات (نظم) مشمولہ: باتیں حسن یار کی، مرتبہ ڈاکٹر طیب منیر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۳۳

iii۔ مدونہ کتب

پہلی صورت: مدون کی تحریر کا حوالہ

ساخت: (مدون کا نام، نوعیت تحریر، مدونہ نسخے کا نام، جلد نمبر، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: اقتدا حسن، (مقدمہ) کلیات قائم، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷

دوسری صورت: مدونہ کتاب سے اصل مصنف کی تحریر کا حوالہ

ساخت: (مصنف کا نام، کتاب کا نام، مدون کا نام، جلد نمبر، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: قائم چاند پوری، کلیات قائم، مرتبہ اقتدا حسن (جلد اول) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷

iv۔ مترجمہ کتب

پہلی صورت: ترجمہ شدہ متن کے علاوہ مترجم کی تحریر یا وضاحت کا حوالہ

ساخت: (مترجم کا نام، تصریح، مترجمہ کتاب کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: محمد پرویز/ سجاد باقر رضوی، (مترجمین) افتادگانِ خاک، از فرانز فینن، نگارشات، لاہور، ص ا

دوسری صورت: ترجمہ شدہ متن کا حوالہ

ساخت: (اصل مصنف کا نام، کتاب کا نام، مترجم کا نام، اشاعتی ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: فرانز فینن، افتادگان خاک، مترجمہ محمد پرویز/ سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ص ۱۴۸

تیسری صورت: مترجمہ کتاب میں مصنف اور مترجم کے علاوہ کسی تحریر کا حوالہ

ساخت: (ناقد کا نام، نوعیت تحریر، کتاب کا نام، مترجم کا نام، ادارہ، مقام، سال اشاعت، صفحہ نمبر)

نمونہ: سارتر، ژاں پال، (دیباچہ) افتادگانِ خاک، مترجمہ محمد پرویز/ سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ص ۱۵۰

۲۔ رسائل/ جرائد/ اخبارات کا حوالہ

ساخت: (مصنف کا نام، تحریر کا عنوان، نوعیت تحریر، نام جریدہ/ اخبار، شمارہ، سال اشاعت، ادارہ، صفحہ نمبر)

نمونہ: تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، دی گولڈن کام: آخری مغلیہ دور کی یادیں، (مضمون) مطبوعہ: دریافت، شمارہ ۸، ۲۰۰۹ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۶

نمونہ ۲: راشد حمید، ڈاکٹر، اقبال کا پاکستان، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۸ نومبر ۲۰۱۰ء، ص ۲

نمونہ۳: انور سدید، ڈاکٹر، چند غیر ملکی کتابیں، (تبصرہ) مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، جلد۴۱، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۰

۳۔ انٹرویو کا حوالہ

ساخت: (نام: جس سے انٹرویو لیا گیا، تصریح، نام: جس نے انٹرویو لیا، مقام، تاریخ، وقت)

نمونہ: احمد ندیم قاسمی، (انٹرویو) از سجاد نعیم، لاہور، ۱۲ اگست ۲۰۱۰ء، بوقت دس بجے دن

۴۔ مکتوب کا حوالہ

ساخت: (مکتوب نگار، تصریح تحریر، مکتوب الیہ، تاریخ)

نمونہ: احمد ندیم قاسمی، (مکتوب) بنام ڈاکٹر قاضی عابد، محررہ ۲ جون ۲۰۰۹ء

نمونہ۲: احمد ندیم قاسمی، (مکتوب) بنام ڈاکٹر قاضی عابد، محررہ ۲ جون ۲۰۰۹ء، مطبوعہ: سیپ، کراچی شمارہ ۱۰، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵

نمونہ۳: احمد ندیم قاسمی، (مکتوب) بنام احمد جاوید، محررہ ۲ جون ۱۹۹۴ء، مشمولہ: مکاتیب احمد ندیم قاسمی، مرتبہ عالیہ نوشین، ادارہ جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء

۵۔ غیر مطبوعہ متون کا حوالہ

ساخت: (مصنف کا نام، نسخہ، مخزونہ / مملوکہ، ادارہ، شخص، مقام)

نمونہ: محبت خان محبت، بیاض قلمی، مخزونہ: انجمن ترقی اردو، کراچی

نمونہ۲: محبت خان محبت، دیوان قلمی، مملوکہ: مشفق خواجہ، کراچی

نمونہ۳: نوازش علی، ڈاکٹر، احمد جاوید کی افسانہ نگاری، (مضمون) مملوکہ: نوید انجم، اسلام آباد

۶۔ انٹرنیٹ مواد کا حوالہ

ساخت: (مصنف کا نام، تحریر کا عنوان، ویب سائٹ، تاریخ، وقت)

نمونہ: انور نسیم، ڈاکٹر، اردو افسانے کا مطالعہ، www.anwarnasim.com، ۲ جون ۲۰۱۰ء، 11:۲۵pm

۷۔ دستاویزات کا حوالہ

ساخت: (دستاویز: نام / شناخت، مملوکہ / مخزونہ)

نمونہ: سند میٹرک (رشید امجد)، عکسی نقل مملوکہ راقم

۸۔ بالواسطہ حوالہ

ساخت: (اصل مصنف، کتاب / مضمون، واسطہ، واسطے کی تفاصیل)

نمونہ: مشفق خواجہ، ڈاکٹر، بحوالہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۶۳

۹۔ حواشی / تعلیقات

موضوعی و سوانحی تحقیقی مقالے میں حواشی و تعلیقات حوالہ جات کا حصہ بن کر پیش ہوں گے۔ ترتیبی نمبروں میں الگ سے انھیں کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔ البتہ عنوان ''حوالہ جات'' کے ساتھ تصریح لازم ہوگی۔ مثلاً ''حوالہ جات / حواشی'' یا ''حوالہ جات / حواشی / تعلیقات''۔ متنی تحقیق میں حواشی و تعلیقات کو الگ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ متن کی ضرورت و نوعیت کے مطابق ان کی نشست پاورقی بھی ہو سکتی ہے اور متن کے آخر میں بھی۔ ایسی صورت میں اولاً حواشی درج کیے جائیں اور بعد میں تعلیقات کا اندارج ہوگا۔

حصہ دوم: کتابیات

کتابیات کا اندراج: رہنما اصول

۱۔ کتابیات میں صرف طے شدہ مختصر تفاصیل درج ہونی چاہییں۔ کتب پر وضاحتی نوٹ لکھنا جائز نہیں؛ اگر ناگزیر ہوں تو انھیں کتابیات کے بجائے ضمائم میں جگہ دی جائے۔

۲۔ کتابیات میں بنیادی و ثانوی مآخذ کی درجہ بندی ہو۔

۳۔ ہر درجے میں اندراجات کو الف بائی ترتیب سے پیش کیا جائے۔

۴۔ پہلے اردو مآخذ کا اندراج ہو۔ بعد میں دوسری زبان / زبانوں کے مآخذ کا انداج۔

۵۔ کتابیات میں مصنفین کے نام ان کے فطری ترتیب کے مطابق آئیں گے۔ (ہدایات و مثال اصول حوالہ میں ملاحظہ ہو)

۶۔ کسی مصنف کی ایک سے زیادہ تصانیف درج کرنی ہوں تو مصنف کا نام دوہرایا جائے۔ (دیکھیے نمونہ: کتب)

۷۔ کتابیات میں مصنف/ مرتب کے نام اور تصنیف میں فاصلہ نہ رکھا جائے۔

۸۔ کتابیات میں کسی اندراج کو انڈر/ اوور لائین نہ کیا جائے۔

۹۔ کتابیات میں کسی اندراج پر دوہرے اوپری واوین استعمال نہ کیے جائیں۔

۱۰۔ کتابیات میں صفحہ نمبر کا اندراج نہیں ہوگا۔

۱۱۔ کتابیات کے لیے 'فہرست اسنادِ محولہ' کا عنوان بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات کا اندراج: مجوزہ طریقۂ کار

۱۔ کتب: نمونہ ۱: جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ہفتم ۲۰۰۸ء

نمونہ ۲: شہزاد منظر (مرتب)، منٹو کے دس بہترین افسانے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۱ء

نمونہ ۳: ۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۲۰۰۴ء

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

۲۔ مقالات: نمونہ: پروین اختر، اردو افسانے پر روسی ادبیات کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء (غیر مطبوعہ)

۳۔ رسائل و جرائد: نمونہ: دریافت (سالنامہ)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ: ۳، ۲۰۰۴ء

نمونہ ۲: اوراق (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ: ۱۵، ۲۰۰۷ء

۴۔ لغات: نمونہ: سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء

نمونہ ۲: نشتر، عبدالحکیم خاں، قائد اللغات، حامد اینڈ کمپنی، لاہور، س ن

۵۔ ویب سائٹس: نمونہ: http://www.yahoo.com/

۶۔ انگریزی کتب: نمونہ:

1.Jung, C. G, Freud and Psychoanalysis, Kegan Paul Ltd. London 1981

2.Narang, G. C., Urdu Language and Literature, Lahore, Vanguard, 1991

حواشی

۱۔ چند اہم مجوزہ اندراجات کے لیے دیکھیے:

i۔ ایس ایم ناز، ڈاکٹر، اردو میں فنی تدوین، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

ii۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

iii۔ عطش درانی، ڈاکٹر، جدید رسمیات تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء

iv۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، رسمیات مقالہ نگاری، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۹ء

۲۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کی یہ رائے لائق توجہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''ناموں کے سلسلے میں اگر شکاگو دستور العمل کی سفارشات پر عمل کیا جائے تو اس سے بڑی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سفارشات مغربی ناموں کے لیے تو درست ہیں لیکن خصوصاً اسلامی ناموں کے سلسلے میں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ ان ناموں سے متعلق کئی اداروں نے اپنی اپنی تجاویز مرتب کی ہیں لیکن ان کی معیار بندی نہیں ہو سکی۔ اردو اہل قلم کو ناموں کے بارے میں اپنے ہاں رائج طریقے پر عمل کرنا چاہیے یا ان کے بارے میں کسی ایک تحقیقی ادارے کی تجاویز کو قبول کر لینا چاہیے۔ اردو میں نام اس طرح لکھے جا رہے ہیں:

نظامی، حسن، خواجہ
آزاد، محمد حسین
شبلی نعمانی
سرسید احمد خان

صدیقی، ابواللیث
کشفی، ابوالخیر
اقبال، علامہ

خاندانی نام، نسبت، تخلص وغیرہ اصل نام سے پہلے لیکن شبلی نعمانی کو نعمانی شبلی لکھنا زیادتی ہوگی۔ اسی طرح مرکب نام کو اس طرح جدا جدا نہ کیا جائے کہ نام کی معنویت میں فرق آ جائے۔ جیسے احمد دین، غلام مصطفٰے کے اجزاء کی ترتیب بدل دی جائے۔''

(محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، اردو میں حوالہ نگاری، مشمولہ: اردو تحقیق (منتخب مقالات)، مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۸۳۔۱۸۲)

۳۔ یہ تفاصیل راقم کے تحریر کردہ کتابچے ''اردو رسمیات مقالہ نگاری'' مطبوعہ شعبہ اردو نمل، ۲۰۱۱ء میں موجود ہیں۔ ضروری ہے کہ یہاں مقتدر اصحاب علم اور اداروں کے مجوزہ یا اختیار کردہ طریقے بھی پیش نظر رہیں۔ ان نمونہ جات سے جہاں حوالے کے اندراج میں تنوع اور رنگا رنگی کا اندازہ ہوگا وہاں اختلافات و اشتراکات کے تقابل سے بہتر صورتوں کی طرف رہنمائی بھی ملے گی۔ نمونہ جات پیش خدمت ہیں:

(مجوزہ طریقہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ادبی تحقیق کے اصول)

i۔ نور الحسن نقوی، سر سید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹)، ۱۷

ii۔ فرمان فتح پوری، مرتب: اردو افسانہ اور افسانہ نگار (دہلی: جامعہ ملیہ، ۱۹۸۲)، ۵۶

iii۔ اصغر عباس، سر سید کی صحافت، مقدمہ خلیق نظامی؛ (علی گڑھ، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۲)، ۱۸۲

(مجوزہ طریقہ: پروفیسر محمد عارف، تحقیقی مقالہ نگاری (طریق کار)، ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء)

i۔ نور الحسن نقوی، سر سید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹) ۱۷

ii۔ فرمان فتح پوری، مرتب، اردو افسانہ اور افسانہ نگار (دہلی: جامعہ ملیہ، ۱۹۸۲ء) ۵۶

iii۔ گیان چند، ''اقبال کے کلام کا عروضی مطالعہ''، مشمولہ اقبال کا فن، مرتبہ گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۳ء) ۱۷۔۱۱۰

(مجوزہ طریقہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، رسمیات مقالہ نگاری)

i۔ خان، سید احمد، مقدمہ ''تاریخ فیروز شاہی'' ص ۷

ii۔ خان، سید احمد، سر، مقدمہ، ۲۰۰۵ء ''تاریخ فیروز شاہی''، مصنفہ ضیاء الدین برنی، سر سید

اکیڈمی، علیگڑھ

iii۔عرشی، امتیاز علی خاں، مقدمہ ''دیوان غالب'' ص ۵

iv۔عرشی، امتیاز علی خاں، مقدمہ، ۱۹۵۹ء ''دیوان غالب'' اسد اللہ خاں غالب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

(مجوزہ طریقہ: ڈاکٹر عطش درانی، اردو قرطاس کار، مشمولہ: خیابان، پشاور، شمارہ: ۲۰)

i۔شاہ ولی اللہ دہلوی، ''دو مکتوب چہار دہم''، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ، نسیم احمد فریدی (مترجم)، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۱۶۸ھ، جلد دوم، ص ص: ۲۱۵ تا ۲۱۷

ii۔فہرست کتب حضرت مرتضٰی حسن چاند پوری (قلمی) جلد ۱، ص: ۴۵ (مخزونہ کتب خانہ مرتضٰی حسن چاند پوری)

(اختیار کردہ طریقہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور)

i۔ریاض الفصحاء، غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبد الحق، ص ۳۶۶، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۴ء

ii۔گلشن ہمیشہ بہار، نصر اللہ خاں خویشگی، مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۲۲۷، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۷ء

iii۔جگر سوز، عیشی، مطبع، مصطفائی شاہجہاں آباد ۱۲۴۸ھ بحوالہ ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' از ڈاکٹر گیان چند، ص ۴۲۷، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۹ء

iv۔سر دلبراں، شاہ سید محمد ذوقی، ص ۲۵۷۔۲۶۰، کراچی ۱۴۰۰ھ

(اختیار کردہ طریقہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ارمغانِ افتخار احمد صدیقی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء)

i۔ڈاکٹر عنوان چشتی، مشمولہ: اقبال۔جامعہ کے مصنفین کی نظر میں 'مرتب: گوپی چند نارنگ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۰ تا ۲۲۲

ii۔سید محمد عقیل: نئی علامت نگاری۔انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۳۴، ۳۵

iii۔میرزا ادیب: مطالعۂ اقبال کے چند پہلو۔ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۵ء

ص ۲۰۳ اور ۲۱۶

(اختیار کردہ طریقہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تحقیقی زاویے، مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء)

i۔مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۴۸ تا ۱۵۸

ii۔تاریخ سندھ، جلد اول، سندھ ادبی اکیڈمی کراچی ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۴

(اختیار کردہ طریقہ: ڈاکٹر عارف نوشاہی، نقد عمر، اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء)

i۔حسام الدین راشدی، تذکرہ شعرای کشمیر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء، طبع دوم، ج ۱، ص ۱۳۲۔۱۳۳

ii۔بدر الدین کشمیری، سراج الصالحین، قلمی، کتابخانہ گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ ۱۰۸۵، صفحہ ۱۵

iii۔رحمان علی، تذکرۂ علمائے ہند، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ / نومبر ۱۹۱۴ء، بار دوم، ص ۲۷۵

(مجوزہ / اختیار کردہ طریقے: جامعات، پاکستان)

نوٹ: پیش کردہ نمونے جامعات کے ایم فل / پی ایچ ڈی کے مقالات اور تحقیقی مجلات سے لیے گئے ہیں۔

۱۔پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ بحوالہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، از محمد عالم خان / مزید: بحوالہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ احمد علی: حیات اور ادبی خدمات، از محمد کامران

i۔ڈاکٹر ثریا حسین ''انتخاب سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ قرۃ العین حیدر۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1990ء۔ صفحہ نمبر 10,11

ii۔ڈاکٹر محمد حسن ''اردو ادب میں رومانی تحریک'' شیخ بشیر اینڈ سنز لاہور۔ صفحہ نمبر 30,31

i۔خالد علوی' ڈاکٹر ۔انگارے۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۵ء۔ ص ۴۳۔

ii۔سجاد ظہیر۔ روشنائی۔ لاہور: مکتبہ اردو۔ ۱۹۷۶ء بار دوم۔ ص ۱۵-۱۶

۲۔زکریا یونیورسٹی، ملتان۔ بحوالہ مقالہ برائے ایم فل، اردو کے افسانوی ادب میں مسعود

مفتی کا مقام، از میمونہ سبحانی/ مزید: بحوالہ جرنل آف ریسرچ اردو، شمارہ ۱۹۔ ۲۰۱۱ء

i۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ’’اردو افسانہ تحقیق و تنقید‘ بیکن بکس، ملتان ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۵۔

ii۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ’’شاعری کی سیاسی و فکری روایت‘‘ دستاویز مطبوعات، لاہور، بار اول، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۱۔

i۔ احمد، ظہور الدین، ۱۹۹۰ء، ’پاکستان میں فارسی ادب‘ جلد پنجم، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان

ii۔ خانم، ارشد، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ’علامہ اقبال کے تصورات فنِ لطیف‘، ملتان، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی۔

۳۔ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔ بحوالہ مقالہ برائے ایم فل، اردو زبان میں بارہ ماسہ کی روایت، از اقبال بانو

i۔ مسعود حسین، ڈاکٹر، مرتب، بحوالہ کتاب ’’افضل کی بکٹ کہانی‘‘، لکھنؤ اردو اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۵

ii۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، بحوالہ کتاب ’’تاریخ ادب اردو‘‘، جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۵ء، ص ۴

iii۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، بحوالہ کتاب ’’شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسہ کی روایت‘‘ طبع اول، دہلی شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲

۴۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ بحوالہ مقالہ برائے ایم فل، قرۃ العین پر علامہ اقبال کے اثرات کا جائزہ، از نسیم عباس/ مزید: بحوالہ: اطرافِ تحقیق، از ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، استاد شعبہ اردو، جامعہ مذکور

i۔ شعر اقبال۔ عابد علی عابد۔ بزم اقبال لاہور سال اشاعت 1959ء، صفحہ نمبر 48

ii۔ ذکر اقبال۔ عبد المجید سالک۔ بزم اقبال لاہور۔ طبع دوم مئی 1983ء صفحہ نمبر 11

i مقالات سر سید [حصہ دوازدہم]؛ مرتبہ مولانا اسمٰعیل پانی پتی؛ مجلس ترقی ادب، لاہور؛ اول، اگست ۱۹۶۳ء؛ ص ۱۸۵۔

ii ہماری داستان؛ خواجہ محمد خان اسد حضروی؛ قلمی۔ مملوکہ: راشد علی زئی (مرتبہ):

اسد اکیڈمی، حضرو ضلع اٹک؛ دسمبر ۱۹۹۴ء؛ ص ۹ تا ۲۸

۵۔ جی سی یونیورسٹی، لاہور۔ بحوالہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، خان احمد حسین خان: شخصیت اور فن، از محمد ہارون قادر

i۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۴ء، ص: ۳۱

ii۔ رفیع الدین اشفاق، سید، ڈاکٹر، اردو میں نعتیہ شاعری، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ص: ۳۱

۶۔ جامعہ پشاور، پشاور۔ بحوالہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، فارغ بخاری: احوال و آثار، از ضیاء الرحمٰن

i۔ تنقیدی تجزیے   عبادت بریلوی   اردو دنیا کراچی ۱۹۵۹ء ص ۱۱

ii۔ گلہائے جعفری   جعفر علی خان جعفری   مرتبہ رضا ہمدانی   مکتبہ ذوالفقار پشاور ۱۹۸۱ء ص ۷

۷۔ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور۔ بحوالہ: الماس، شمارہ ۱۲، ۱۱۔ ۲۰۱۰ء

i۔ سہیل بخاری ڈاکٹر، (۱۹۸۷ء) اردو داستان، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۳۹۵

ii۔ آرزو چوہدری ڈاکٹر (۱۹۸۸ء) عالمی داستان، عظیم اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، ص ۱۷

۸۔ سندھ یونیورسٹی، جامشورو۔ بحوالہ: تحقیق، جلد ۱۷، شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء

i۔ سلطانہ بخش ڈاکٹر: ’’پاکستانی اہل قلم خواتین‘‘، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸۔ ۵۰۔

ii۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر: ’’صحافت پاکستان و ہند میں‘‘، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۰۔

تدوینِ متن: مراحل، مسائل اور تجاویز

تدوینِ متن، تحقیق کا ایک ایسا شعبہ ہے جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جب تک کوئی متن پوری صحت کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہیں ہوگا اس وقت تک اس کی قدر و قیمت کے سارے اندازے بھی محض خام ہی ہوں گے۔ متن کیا ہے؟ کسی مصنف کی تحریر جو قلمی بھی ہو سکتی ہے اور مطبوعہ بھی (۱)۔ اور تدوین متن کا معنی ''جمع نمودن و تالیف کردن''، یعنی متن کو جمع و مرتب کرنا ہے۔ ایک علم کی حیثیت سے تدوین متن کا بنیادی فریضہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینا ہے۔ یہ مخصوص قواعد اور اصولوں کی روشنی میں ایک باقاعدہ اور مرحلہ وار سرگرمی ہے اور اس کا محور 'متن' ہے۔ مقاصد کا دائرہ بھی اسی محور کے گرد گھومتا ہے یعنی: مستند، قابل بھروسہ اور قابل اعتبار متن کی بازیافت؛ سرقہ و جعل سازی کی نشاندہی؛ سہو اور بھول چوک کی نشاندہی؛ اور متن کے نقصان زدہ اور گم اندراجات تک رسائی وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ذیلی مقاصد بھی ہیں جن میں متن کی روایت، تاریخی حیثیت، لسانی، علمی و ثقافتی شناختیں اور صاحبِ متن کا احوال وغیرہ اہم ہیں۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو اس علم کی حساسیت اور ناگزیریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ضمنی و ذیلی نہیں، اساسی نوعیت کا علم ہے۔ متن کے مستند و غیر مستند اور مکمل و نامکمل ہونے کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا معمولی اور عام کام نہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو علم تنقید اور علم تاریخ کی استواری علم تدوین ہی کی رہین منت ہے۔ متن کی درست تفہیم اور صحیح معیار بندی اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ طے ہو کہ متن درست، مکمل اور مستند ہے۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے اس علم کی ناگزیریت دوچند ہے کیونکہ بہت سے قدیم متون کی بازیافت کے ساتھ بیشتر کلاسیکی متون کے مستند و غیر مستند ہونے کا فیصلہ ابھی ہونا باقی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن: ''غالب کے استثناء کے ساتھ، شاید ہی اردو کا کوئی قابل ذکر قدیم شاعر ایسا ہو جس کے کلام کا صحیح متن دستیاب ہوتا ہو۔'' (۲)

تدوین متن کے عمل کو کام کی نوعیت کی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو واضح طور پر یہ دو زمروں میں منقسم نظر آتا ہے۔ ایک مخطوطات کی تدوین اور دوسرا زمرہ مطبوعات کی تدوین۔ مخطوطات سے مراد مشینی چھپائی سے قبل کی تحریریں ہیں۔ عام طور پر قلمی تحریروں کو مخطوطہ کہنے کا رواج ہے لیکن یہ درست نہیں۔ ہر قلمی تحریر مخطوطہ نہیں۔ مخطوطات کا اطلاق زمانہ قبل از طباعت کی قلمی تحریروں پر ہوتا ہے۔ مخطوطات کے لیے ایک شرط اس کا کتابی صورت میں یا منضبط ہونا بھی بتائی جاتی ہے جو کہ مناسب نہیں۔ مخطوطہ غیر کتابی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، اس کی اکائیاں منتشر بھی ہو سکتی ہیں اور یہ ناقص و نامکمل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ حالتیں کسی متن کو مخطوطے کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتیں تاہم یہ ضرور ہے کہ ان صورتوں میں تدوینی مشکلات زیادہ ہوتی ہیں۔ مخطوطات کے لیے روشنائی سے کاغذ پر لکھا ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ یہ کسی دھات، کپڑے، پتھر، چمڑے اور اسی نوعیت کی دیگر اشیاء پر کھدے ہوئے، ابھارے ہوئے یا چسپاں بھی ہو سکتے ہیں۔ پس قلمی کا مفہوم یہاں قلم کی مناسبت سے نہیں بلکہ دور طباعت سے قبل کے ان وسیلوں کی مناسبت سے ہے جو متن کو تحریری شکل میں لانے کے لیے اختیار کیے جاتے تھے۔ اردو مخطوطات چونکہ زیادہ تر کاغذی صورت میں ہیں اس لیے ہمارے ہاں مخطوطات کی عام تفہیم 'قدیم قلمی کتاب' ہی ہے۔

مطبوعات کی تدوین سے مراد ایسے متون کی تدوین ہے جو قدیم میں شائع ہوئے اور بعد میں کمیاب ہو گئے۔ یا ایسے متون کہ جن کی اشاعتیں ناقص تھیں یا ایسے متون جو شائع تو ہوئے لیکن ان کے متن کے حوالے سے شکوک و شبہات ہوں۔ جدید زمانے کی مطبوعات

جو مصنف کی نگرانی میں باہتمام اشاعت پذیر ہوتی ہیں، اس زمرے میں شامل نہیں۔

یہاں ایک تیسرا زمرہ بھی پیش نظر رہے یعنی مسودات کی تدوین۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مضمون ''فن تدوین'' میں اسے اقسامِ تدوین میں شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''نئی کتابیں یا تحریریں جب اشاعت کے لیے کسی ناشر یا مدیر کے پاس آتی ہیں تو وہ انھیں پڑھ کر یا پڑھوا کر ان کے املا کو ٹھیک کراتا ہے۔ ان کے رموزِ اوقاف کو درست کراتا ہے۔ حسب ضرورت پیراگراف گھٹاتا یا بڑھاتا ہے۔ زبان و بیان کو صحیح و بہتر بناتا ہے۔ تکرار یا اعادہ کو دور کرتا ہے اور اسے اس صورت میں لے آتا ہے کہ قاری اسے آسانی کے ساتھ بغیر کسی الجھن کے پڑھ سکے۔ یہ فنِ تدوین ہے جس پر صاحب علم ایڈیٹر یا اچھا ناشر عمل کرتا ہے اور اس کام کے لیے فنِ تدوین کے ماہروں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔'' (۳) اس زمرے کو فن تدوین میں شامل کرنا مناسب نہیں کہ اول تدوین متن کی روایت میں کبھی بھی کاتب، مدیر، مطبع یا ناشر کی اصلاح کو تدوین نہیں سمجھا گیا اور دوسرے اگر موجودہ دور میں اس سرگرمی پر نظر کی جائے تو اسے فنِ کانٹ چھانٹ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ کانٹ چھانٹ مصنف کی مرضی کے خلاف اور کسی ادارے یا مدیر کے خودساختہ اشاعتی پیٹرن کے تحت ہوتی ہے۔ یہ ایک مختلف سرگرمی ہے اور اس کا مقصد متن کو مصنف کے بجائے قارئین یا مدیرانِ ادارہ کے معیارات کے مطابق بنانا ہے اور یقیناً یہ بات زیر بحث فن تدوین کے بنیادی مفہوم یعنی ''متن کو منشائے مصنف کے مطابق بنانا'' سے متصادم ہے۔

تدوین متن کا کام مختلف مراحل میں منقسم ہے۔ ان مراحل کو تین جلی عنوانات: تحقیقِ متن؛ تدوین متن؛ اور ترتیب متن کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہر عنوان کے کئی ذیلی عنوانات ہیں جن کی تفصیلی کچھ یوں ہے:

ا۔ تحقیقِ متن:

تدوین متن کے ضمن میں یہ اولین مرحلہ ہے۔ اس میں کئی بنیادی نوعیت کے کام شامل ہیں مثلاً جوازِ تدوین کی تشکیل، تلاش متن، ابتدائی قرأت، خارجی و داخلی پرکھ، شہادتوں کی توجیہہ و ترتیب، اور اساسی متن کا تعین وغیرہ۔ عام طور پر اس مرحلے کی جزئیات پر کم توجہ دی جاتی ہے جس کا نتیجہ ناقص تدوین کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ تدوین کے کام کو محض تصحیح متن سمجھنا ایک عمومی رویہ ہے اور غالباً اسی رویے کی بدولت تدوین کو ایک سہل بلکہ بعض صورتوں میں دوسرے درجے کی تحقیق سمجھا جاتا ہے۔ بعض اصحاب تو اسے تحقیق کہنے سے ہی گریزاں ہیں (۴)۔ یقیناً کند ذہنوں کے لیے اس تحقیق کو سمجھنا ایک امر محال ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ کسی فن سے وابستگی، اس کے دائرہ کار سے واقفیت اور طریقہ کار پر غور سے عدم تفہیم کی صورتحال سے نکلا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی ملحوظ رہے کہ تدوین کا کام سراسر عملی مشق سے عبارت ہے۔ اور عمومی دانش کے مطابق ہر وہ کام جو عمل اساس ہو اس کے اصول و ضوابط سہل ہوتے ہیں۔ اور ان اصولوں اور ضوابط پر رائے زنی اس سے بھی زیادہ سہل ہوتی ہے۔ پس ایسے اصحاب جنھوں نے کبھی کسی متن، بہ طور خاص قدیم متن کو تدوین کی غرض سے ہاتھ نہیں لگایا ان کے لیے تلاش متن، اس کی قرأت، خارجی و داخلی پرکھ، شہادتوں کو توجیہہ و ترتیب اور اساسی متن کا تعین وغیرہ مختلف کاموں کا مجموعہ نہیں بلکہ محض ایک کام، یا محض ایک فضول کام ہے۔ لیکن اس فن سے وابستہ یا اس کو سیکھنے پر آمادہ اصحاب جانتے ہیں کہ تدوین کے اولین مرحلے سے وابستہ یہ کام کس قدر متنوع، پیچیدہ، مشقت طلب اور جان لیوا ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کاموں کی نوعیت اور متعلقہ جزیات پیش ہیں۔ بیانیہ کے تسلسل کے پیش نظر مثالوں سے گریز کیا گیا ہے اور تفہیم میں آسانی کے لیے صرف چیدہ نکات کو اہمیت دی گئی ہے۔

جوازِ تدوین کی تشکیل:

تدوین متن کے سلسلے میں یہ پہلا قدم ہے۔ اس میں کسی الجھن یا مسئلے کی بنیاد پر کوئی متن لائق تدوین قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی متن کے بارے میں یہ شہادت کہ الحاقی ہے، یا سرقہ ہے، یا مسخ شدہ ہے۔ ایک ہی متن کا مختلف صورتوں میں ملنا؛ کسی متن کے کامل و ناقص میں تمیز نہ ہونا؛ کسی متن کا کمیاب ہونا، کسی متن کا قلمی ہونا، یا کسی متن کا قدیم املا و رسم الخط کی وجہ سے نا قابل قرأت ہونا وغیرہ ایسی ٹھوس وجوہ ہیں جنہیں تدوین متن کا جواز بنایا جا سکتا ہے۔ بغیر جواز کے کسی متن کی تدوین کارِ لاحاصل ہے۔ مدون پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اور کیوں کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ابتدائی مطالعہ اور کچھ واضح شہادتوں کی جمع بندی ضروری ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی قدیم متن ہاتھ آیا اور بس کام شروع۔ ہوسکتا ہے کہ جس متن کو تدوین کے لیے منتخب کیا جائے اس پر پہلے کام ہو چکا ہو، یا کام جاری ہو یا متن ایسا ہو کہ نا کافی شہادتوں یا نا قابل قرأت ہونے کی وجہ سے اس پر کام ممکن نہ ہو۔ مدون کو اولین سطح پر ہی ان امور پر غور کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں مطالعے کے ساتھ اساتذہ اور معاصر اصحاب علم سے مشاورت بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔

تلاشِ متن:

متن پر اولین غور و حوض کے بعد اگلا قدم منتخبہ متن کے جملہ اجزا، یا گمشدہ سلسلوں یا منتشر آثار کی تلاش ہے۔ تلاش متن کا یہ عمل بعض صورتوں میں بہت طویل اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ بطور خاص کمیاب متون کے آثار تک پہنچنا ایک صبر آزما کام ہے۔ معاصر تذکروں، قلمی بیاضوں، روزنامچوں، سفرناموں، خطوط، ملفوظات، شعری گلدستوں، انتخابات اور اسی طرح کے دیگر ادبی مآخذ کے علاوہ غیر ادبی مآخذ مثلاً اخبارات، رسائل و جرائد، پٹوار خانوں / سکولوں کے اندراجات اور سول لسٹوں وغیرہ کی چھان پھٹک اکثر صورتوں میں پیش پا افتاد ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے سرکاری و نجی سطح پر قائم لائبریریوں، ذخیرۂ مخطوطات کی

فہرستوں، قدیم محفوظات اور ادبی متون کے ذخیروں تک رسائی اہم ہے۔ یہ کام ذاتی تگ و دو اور لگن سے عبارت ہے۔ اکثر لائبریریوں اور محفوظات میں موجود قدیم متون کی فہرستیں دستیاب نہیں اور اگر کہیں فہرستیں ہیں تو مطلوبہ متن متعلقہ جگہ پر نہیں ہوتا یا ہوتا ہی نہیں۔ قدیم ذخائر کی بابت اطلاعات کی فراہمی کا بھی کوئی موثر نظام موجود نہیں۔ بعض لائبریریوں نے آن لائن کیٹلاگنگ کر رکھی ہے لیکن یہ کاغذی کارروائی ٹائپ کی سہولت ہے۔ پس اس مرحلے میں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ مدون کی ذاتی جمع تفریق ہے۔ مختلف علاقوں کے سکالرز سے ذاتی تعلقات اس سلسلے میں معاون بنتے ہیں یا بنفس نفیس شہر شہر جانا پڑتا ہے اور بسا اوقات اس کام میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

ابتدائی قرأت:

تدوین متن کے سلسلے میں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ مدون منتخبہ متن کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ متن کا کچھ حصہ پڑھ کر باقی متن کے بارے میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ قابل قرأت ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تلاش متن کے فوراً بعد اس کی ایک مکمل قرأت کر لینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے متن کے کئی اجزا مدون کی سمجھ سے باہر ہوں یا ایسے ہوں کہ ان کو قابل تفہیم بنانے میں بہت وقت درکار ہو۔ اس ابتدائی قرأت کا ثمر بعض بنیادی نوعیت کی معلومات کی صورت میں بھی ملتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے کہ آگے بڑھا جائے یا رکا جائے۔

قدیم متون کی قرأت ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ اردو کے حوالے سے بعض اصحاب اس پیچیدگی کو رسم الخط کی غرابت پر محمول کرتے ہیں (۵)۔ حالانکہ دیکھا جائے تو زمانۂ قدیم کے متون میں اپنے عہد کا مروج املا اور انداز کتابت ملتا ہے اور اپنے زمانے میں وہ قطعی نامانوس نہیں ہوتا۔ اُس عہد میں کسی نے اسے ناقص نہیں کہا ہوتا اور نہ ہی یہ الجھن کہ پڑھا نہیں جا رہا۔ حقائق پر غور کیا جائے تو دنیا کی ہر زبان میں قدیم متون کی قرأت مشکل رہی

ہے اور اس کی وجہ رسم الخط کی غرابت نہیں بلکہ زمانی بُعد اور تحریر کے مذاق اور وسیلوں کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اردو کے قدیم متون کے حوالے سے بھی یہ بات ملحوظ رہے اور متن کی قرأت کے لیے متعلقہ عہد کے مذاقِ تحریر سے آشنائی کو یقینی بنایا جائے تو نامانوسیت کو مانوسیت میں بدلا جا سکتا ہے۔ مثلاً اٹھارویں اور انیسویں صدی کے متون میں املا کی عام روش لفظوں کو ملا کر لکھنا، یائے معروف و یائے مجہول میں فرق نہ کرنا، نون غنہ کے بجائے نون ساکن کا استعمال، ک اور گ میں عدم تفریق، ہائے دوچشم کی جگہ ہائے ہوز کا استعمال، حرکات ملفوظی کا استعمال، رموز اوقاف کی بے قاعدگی اور خطِ شکستہ کی صورت میں حروف کی من پسند طوالت و تخفیف وغیرہ ایسے عام نشانات ہیں جن پر توجہ سے اس دور کے کسی بھی متن کی قرأت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ واضح ہے کہ مشق کے بغیر اس لیاقت کا حصول ممکن نہیں۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ کوئی بھی تدوینی منصوبہ متن کی کامل قرأت کے بغیر انجام دینا تو ایک طرف، شروع کرنا بھی بیوقوفی ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر محققین بسا اوقات متن کی دستیابی کے باوجود اس کی تدوین سے گریزاں رہتے ہیں تاوقتیکہ کوئی سبیل نکلے۔

خارجی و داخلی پرکھ:

قرأت کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے بعد اگلا قدم متن کی داخلی و خارجی پرکھ ہے۔ ایسے متون جن کے مصنف، تاریخ تصنیف و طباعت، متن کے نام اور مقام تصنیف و مطبع وغیرہ کے حوالے سے معلومات مفقود ہوں؛ خارجی و داخلی جائزہ زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ یہ گہرا تنقیدی تجزیہ ٹائپ کا کوئی عمل نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے نشانات تک پہنچنا ہے جن کے ذریعے متن کی شناخت ممکن ہو سکے یا اس کے عہد و مصنف وغیرہ کا تعین ہو سکے۔ جن متون میں یہ نشانات واضح ہوتے ہیں یا جن میں کوشش کر کے کچھ سراغ لگا لیا جاتا ہے ان کے لیے یہ مرحلہ زیادہ تکلیف دہ نہیں لیکن جہاں صورتحال اس کے برعکس ہو وہاں

کام گویا رک سا جاتا ہے۔ نسخوں کے سرورق، ابتدائیے، ترقیمے، تکملے اور حاشیے کھوج کے اس عمل میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں اور ان سے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور مل جاتی ہیں۔ ان سب معلومات کو الگ کاغذ پر لکھ لینا مناسب رہتا ہے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ مختلف نوعیت کی معلومات کے الگ الگ کارڈز بنا لیے جائیں۔ متن کے داخلی مطالعے میں بھی اسی طریقہ کار کے تحت مطلوبہ معلومات کو نشان زد کرنا مفید ثابت ہوتا ہے۔

شہادتوں کی توجیہہ و ترتیب:

متن کے خارجی و داخلی مطالعے سے حاصل شدہ معلومات اور دیگر مآخذ سے جمع شدہ آثار کو ایک تقابلی مطالعے سے گزارنا، متعلقہ مسئلے کی بابت مختلف کڑیوں کو جوڑنا اور ان میں اختلاف و ارتباط کو سمجھنا اور ان کی بنیاد پر نتائج کی ایک فہرست مرتب کرنا اس مرحلے کا بنیادی کام ہے۔ یہ مختلف نوع کی معلومات کو تجزیے سے گزار کر ایک ورق پر لانے کا عمل ہے۔ متن کا نام، قلمی و مطبوعہ نسخے، سال تصنیف و کتابت، متعدد اشاعتیں، اشاعتوں کا اختصاص، نسخوں کی ہیئت و اوصاف، متن کے اندراجات، مصنف کے حوالے، عہد و علاقے کی تفاصیل، مختلف مآخذ کا اختلاف، معاصر و غیر معاصر شہادتیں اور اسی نوعیت کی دیگر بہت سی معلومات یہاں ایک ایسی صورت میں تشکیل دی جاتی ہیں جس سے اساسی نسخے کے تعین اور بعد میں تدوین و تصحیح کے سلسلے میں مدد فراہم ہو۔ یہ ترتیب دی ہوئی معلومات بعد ازاں زیادہ تفصیلی بحث اور تجزیے کے ساتھ مقدمے کا حصہ بنتی ہیں۔ یہاں فقط ایک ایسی ترتیب درکار ہوتی ہے جس سے متن کے تسلسل، مصنف کے مزاج، اور اس کے لسانی و ادبی تعلق کی وضاحت ہو سکے۔

اساسی نسخے کا تعین:

تحقیق متن کے سلسلے کا ایک اہم کام واضح دلائل کے ساتھ اساسی اور بنیادی متن کی نشاندہی ہے۔ اس کی ضرورت تب پیش آتی ہے جب کسی متن کے ایک سے زیادہ قلمی،

مطبوعہ یا قلمی و مطبوعہ نسخے دستیاب ہوں۔ (٦) نسخوں کے تقابل و موازنے سے کسی ایک نسخے کی برتری ثابت کرنا محقق کے لیے کڑا امتحان ہوتا ہے۔ بسا اوقات معلومات کی کمی یا محقق کی ناپختگی کی بدولت یہ فیصلہ تدوین کے سارے عمل کو بوگس بنا دیتا ہے۔ اگرچہ اس مرحلے میں محقق کی معاونت کے لیے کچھ اصول موجود ہیں لیکن زیادہ تر یہ کام تجربے اور اٹکل ہی سے انجام پاتا ہے۔ بالخصوص ایسے متون جن میں تاریخ تصنیف، یا کتابت یا طباعت وغیرہ کا اندراج نہ ہو۔ یا ایسے متون جن میں شواہد تو موجود ہوں لیکن نتائج، قیاس کے ذریعے مرتب ہوں۔ عام اصولوں پر نظر کی جائے تو خطی نسخوں میں مصنف کے ہاتھ سے لکھے نسخے کو اساسی قرار دیا جاتا ہے۔ عدم دستیابی کی صورت میں تدریجاً مصنف کی زیر نگرانی تیار گیا نسخہ، اس کے کسی عزیز، دوست یا شاگرد کا مرتب یا کتابت کردہ نسخہ، یا کسی مقتدر شخصیت کے لیے باہتمام تیار کیا گیا نسخہ اساسی قرار پاتا ہے۔ نسخے کے کامل و ناقص ہونے کی بنیاد پر یہ ترتیب بدل بھی سکتی ہے۔ نسخے کا خوش خط اور بدخط ہونا بھی ترتیب کو متاثر کرتا ہے۔ نسخے کا قدیم ترین ہونا اساسی نسخے کے تعین میں کوئی اصول نہیں۔ تاہم صورتحال کی مناسبت سے فیصلہ سازی میں یقیناً یہ ایک اہم عامل ہے۔ مطبوعہ نسخوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو مصنف کی زیر نگرانی شائع ہونے والا یا اس کا تصحیح شدہ نسخہ اساسی قرار پائے گا۔ عدم دستیابی کی صورت میں ایسے نسخے کو ترجیح دی جائے گی جو مصنف کی زندگی میں طبع ہوا۔ اگر طباعت ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی تو ایسا نسخہ اولیت حاصل کرے گا جو کسی معروف مطبع یا مصنف کے کسی تعلق دار یا شاگرد کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کے بعد مصنف کی وفات کے فوری بعد کے نسخوں کی اہمیت ہے۔ کسی متن کی پہلی اشاعت یقیناً اہم ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ پہلی اشاعت ہی اساسی متن قرار پائے۔ پہلی اشاعت اگر ناقص ہے اور دوسری کامل تو اساسی متن کے لیے دوسری اشاعت قابل ترجیح ہوگی۔ اسی طرح اگر متعدد اشاعتیں ہوں تو قابل ترجیح وہ متن ہوگا جس کو مصنف نے درست قرار دیا اور اس کی

شہادت مہر یا خط وغیرہ کی صورت میں ملے یا وہ متن جو مصنف کے زیر مطالعہ رہا اور اس پر مصنف نے حاشیے یا نوٹ لکھے یا ایسا متن جو کسی صاحب علم کے زیر مطالعہ رہا اور اس نے اندراجات پر رائے دی یا ایسا متن جو باہتمام شائع کیا گیا وغیرہ۔

۲۔ تدوین متن:

فن تدوین کا بنیادی زمرہ۔ اس کے لیے تصحیح متن اور ترتیب متن کی اصطلاحیں بھی رائج ہیں لیکن زیادہ واضح اور مناسب اصطلاح تدوین متن ہی ہے۔ اس مرحلے میں کسی متن کی اصل / درست صورت میں بحالی کا کام باقاعدہ طور پر اور واضح و طے شدہ ضوابط کے مطابق انجام پاتا ہے۔ باقاعدہ طور پر اس لیے کہ اب مدون براہ راست ان تحریری علامتوں کی تفہیم و توجیہہ کرتا ہے جن سے کوئی متن صورت پذیر ہوا۔ حروف، الفاظ، جملوں، نقطوں، شوشوں اور اعراب کا ایک ایسا تسلسل جو مروج اشکال کے مقابلے میں نامانوس ہو اور جس کے تعین کے لیے تاریخی شہادتوں کی ضرورت پڑے، اور اس میں رخنے بھی ہوں اور شگاف بھی اور قدم قدم اختلاف اشکال بھی مشکل پیدا کریں لیکن مدون کمر بستہ رہے اور بھرپور ہنرمندی کے ساتھ درست تفہیم و توجیہہ کو جا پہنچے تو اس نتیجہ خیز سرگرمی کو تدوین متن کہیں گے۔ متنوع، مبہم اور پیچیدہ اشکال کے اس وسیع تر تسلسل میں اصل اور نقل، حقیقی و فرعی اور درست و غلط کا امتیاز، ایک زبردست ہنرمندی کے بغیر ممکن نہیں۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ کسی متن کے بارے میں جان لینا ایک بات اور اس کی تدوین کرنا ایک دوسری بات ہے۔ جہاں تک اس سرگرمی کے اہم امور کا تعلق ہے تو ان میں تعین متن و تقابل نسخ، تصحیح قیاسی، حواشی و تعلیقات اور فرہنگ کی تیاری وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں ہر عنوان سے متعلق چیدہ نکات پیش خدمت ہیں۔

تعین متن و تقابل نسخ:

تدوین کے عمل میں اساسی نسخے کو بنیاد بنا کر متن کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ اساسی نسخے کو دیکھ کر اس کے مطابق متن لکھ لینے کا نام نہیں بلکہ تقابل نسخ اور دیگر شہادتوں کی بنا پر اساسی نسخے کے متن کی توثیق، ترمیم یا تصحیح کا ایک مسلسل تجزیہ ہے۔ اس تجزیے سے حقیقی متن کی بازیافت ہوتی ہے اور یہ کوئی زبانی کلامی کام نہیں بلکہ مدون کو اس تجزیے کا تحریری ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ مواد حواشی میں فراہم کیا جاتا ہے۔ تقابل نسخ کے عمل کو سہل بنانے کے لیے عام طور پر مختلف نسخوں کو نام دے دیے جاتے ہیں جو کبھی الف، ب، ج، د وغیرہ اور کبھی کسی شخص، شہر، علاقے یا ذخیرہ سے نسبت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ تدوین میں چونکہ ان کا مسلسل حوالہ دینا ہوتا ہے اس لیے اکثر اختصارات سے کام لیا جاتا ہے۔

حتمی متن تشکیل دیتے وقت قدیم املائی نظام کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ بعض اصحاب قدیم املا کو برقرار رکھنے اور بعض بدل دینے کے حامی ہیں۔ زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ قدیم املا کو مروج املا میں بدل دیا جائے اور اس تبدیلی کی تفصیل حواشی یا مقدمے میں دے دی جائے۔ (۷) دراصل متن کی تدوین کی ہی اس غرض سے جاتی ہے کہ دورِ حاضر کا قاری اس سے مستفید ہو سکے اگر املا کو بدلنا نہیں اور متن کو قابل قرأت نہیں بنانا تو پھر بہتر ہے کہ اس کے عکس چھاپ دیے جائیں۔ متن کی تدوین میں قدیم املا کو جدید بنانا، رموزِ اوقاف اور اعراب کا اہتمام کرنا، متن کے حل طلب امور کو زیر بحث لانا، مشکل الفاظ اور عبارتوں کی تفہیم پر توجہ دینا، پیراگرافس، عنوانات اور متن کے مختلف اجزا کی ترتیب میں سہولت بہم پہنچانا وغیرہ ایسے کام ہیں کہ جو تدوین کے اس مرحلے میں کرنے پڑتے ہیں۔ شعری متون کی تدوین میں عروضی واقفیت بنیادی تقاضا ہے۔ اگر کسی مدون میں یہ خوبی نہیں تو اسے شعری متون کی تدوین کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

تصحیح قیاسی:

یہ تعین متن ہی سے جڑا ہوا کام ہے۔ بعض اوقات کاتب کی لاپرواہی کی وجہ سے بہت سے غلط الفاظ متن میں جگہ پا جاتے ہیں یا اشعار کی ترتیب میں فرق پڑ جاتا ہے یا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کاتب ازخود ایک لفظ کی بجائے اس سے ملتا جلتا کوئی لفظ عبارت میں ٹھونس دیتا ہے جس سے شعر بے وزن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مدون کو نسخوں کے تقابل سے اصل لفظ کو متن میں جگہ دینی ہوتی ہے اور الحاقی الفاظ کو حاشیے میں درج کرنا ہوتا ہے۔ ایک ہی نسخہ دستیاب ہونے کی صورت میں محقق' مصنف کے مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اجتہادی رویہ اختیار کر سکتا ہے لیکن اس میں انتہائی احتیاط کو مدِ نظر رکھا جانا لازمی ہے۔ یہ صورت اس وقت بھی پیش آتی ہے جب نسخہ کسی وجہ سے نقصان زدہ ہو۔ اسے دیمک نے چاٹ لیا ہو، پانی سیلنگ یا فنگس کی وجہ سے الفاظ ضائع ہو گئے ہوں یا عکسی نسخے میں مشین کی خرابی کی وجہ سے متن کٹ گیا ہو یا ورق کا کچھ حصہ پھٹا ہوا ہو۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کاتب عجلت میں کچھ الفاظ چھوڑ گیا ہو یا کہیں سیاہی گر جانے کی وجہ سے پڑھا جانا ناممکن ہو۔ ان تمام صورتوں میں محقق تصحیحِ قیاسی سے کام لیتا ہے۔ جس کا طریقہ کار یہ ہے کہ متن کے اندر قوسین میں چھوڑے ہوئے یا نقصان زدہ الفاظ دے دیئے جاتے ہیں اور ان پر نمبر لگا کر حاشیے پر واضح کر دیا جاتا ہے کہ تصحیح قیاسی کی گئی ہے۔

حواشی و تعلیقات:

تعین متن کے سلسلے جو امور بحث طلب ہوتے ہیں یا جن کا حوالہ، دلیل یا ثبوت فراہم کرنا مقصود ہوتا ہے انھیں متن سے الگ ترتیب وار لکھ لیا جاتا ہے۔ انھی عبارتوں کو حواشی کہتے ہیں۔ بعض امور کی بابت زیادہ وضاحت، علمی نکتہ دانی یا تعبیر و توجیہہ کی ضرورت ہوتی ہے انھیں بھی حواشی کے ساتھ یا الگ سے ترتیب وار لکھ لیا جاتا ہے۔ یہ تعلیقات ہیں۔ حواشی اور تعلیقات کو الگ الگ پیش کرنے کی روایت بھی موجود ہے اور ایک ساتھ لکھنے کی

بھی۔ صورتحال کی مناسبت سے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ حواشی و تعلیقات کا تعلق تدوین سے ہے نہ کہ متن سے۔ یعنی متن ان کے بغیر بھی قائم بالذات ہے لیکن تدوین، حواشی و تعلیقات کے بغیر نامکمل ہے۔ کسی بھی تدوینی کام کو اعتبار اسی صورت میں ملتا ہے جب حوالے و اسناد اور تعبیرات و توجیہات لکھی ہوئی صورت میں موجود ہوں۔ ان کی پیش کش پاورقی بھی ہو سکتی ہے اور متن کے آخر میں بھی۔ تاہم تدوین میں پاورقی حواشی مفید ہوتے ہیں لیکن ان میں طوالت سے گریز لازم ہے۔ ایسی صورت میں تعلیقات الگ سے متن کے آخر میں درج کرنا مستحسن ہے۔

فرہنگ:

فرہنگ تدوین کا ایک لازمی و ضروری حصہ ہے۔ خاص طور پر قدیم متون کی تدوین میں اس کے بغیر گزارا نہیں۔ فرہنگ میں کسی متن سے متعلق مشکل الفاظ، تراکیب، محاورات، ضرب الامثال، متروک الفاظ، غیر زبانوں کے الفاظ وغیرہ کی فہرست اور معانی درج کیے جاتے ہیں۔ اس سے قدیم متون کی تفہیم و توضیح میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ فرہنگ مختصر بھی ہو سکتی ہے اور طویل بھی لیکن اس کو عمومی نہیں ہونا چاہیے یعنی یہ ہر طرح کے الفاظ کے بجائے کسی متن کے خصوصی لسانی سرمائے پر مشتمل ہو۔

۳۔ ترتیب متن:

تدوین متن کا آخری مرحلہ ترتیب متن ہے۔ اس میں تمام تر مواد کو ایک موثر اور قابل مشاہدہ صورت میں منضبط کرنا ہوتا ہے۔ بہ طور خاص تحقیقی حاصلات اور تدوینی نتائج کو ایک واضح شکل دینی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مقدمہ تحریر کیا جاتا ہے جس میں مصنف کے حالات و کوائف، متن کا تعارف، متن کی اہمیت و افادیت، تدوین کی ضرورت و جواز، تدوین کے لیے کی جانے والی کوششیں اور مسائل، مختلف نسخوں کی فراہمی، خصائص اور شناختیں، تدوین کے لیے اختیار کردہ اصول و ضوابط، متن کے جملہ مباحث اور لسانی و فکری امتیازات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔ مقدمہ اگرچہ آخر میں لکھا جاتا ہے لیکن اس کی پیشکش متن سے پہلے ہے۔

ترتیب متن میں مقدمے کے علاوہ کئی کام تدوینی عمل کو ایک بہتر صورت میں لانے سے متعلق ہیں۔ متن کی کمپوزکاری، پروف خوانی، حوالوں اور حواشی کا بہ تکرار تقابل، نمبر شماری پر توجہ، شعری متن ہونے کی صورت میں عمودی و افقی پیشکش کی بابت فیصلہ، عنوانات، ذیلی عنوانات اور شعروں و مصرعوں کا ربط و انصرام، نثری متون میں پیراگرافنگ اور متن کے مختلف اجزا میں توازن و تسلسل، حواشی اگر پاورقی ہوں تو ہر صفحے کی مناسبت سے نمبر اندازی، فونٹ، فونٹ سٹائل اور علامات وغیرہ ایسے امور ہیں جو بہت توجہ طلب ہوتے ہیں۔ اس مرحلے میں بھی کم و بیش اتنی ہی محنت درکار ہوتی ہے جو تحقیق متن اور تدوین متن کے ضمن میں روا رکھی جاتی ہے۔

یہاں ایک اہم کام اشاریہ سازی بھی ہے لیکن یہ اس وقت انجام دینا چاہیے جب سارا کام ایک مکمل کتابی صورت میں ترتیب پا جائے۔ اشاریہ کی افادیت میں کلام نہیں لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اشاریے کے اندراجات متن کے مطابق نہیں ہوتے جس کی وجہ سے کئی صفحات پر پھیلا یہ کام رائیگاں جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ صفحوں اور متن کی حتمی صورت سے قبل نمبر اندازی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کام میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اشاریے کو مختلف زمروں میں تقسیم کر لینا چاہیے یعنی اشخاص، اماکن، کتب، ادارے، اصطلاحات وغیرہ۔ اس سے اشاریے کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

ترتیب کے ضمن میں ایک اور اہم کام ضمیمہ جات کی تیاری ہوتا ہے۔ ضمائم میں متن کے عکس کے علاوہ اہم شہادتوں، نقشوں، خطوط، انٹرویوز اور خطی مواد کا عکس فراہم کرنا تدوینی پیشکش کو ثروت مند بنا دیتا ہے۔ ضمائم کی تیاری میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ

لائق استفادہ ہوں۔ بسا اوقات اتنے خراب پرنٹ ضمائم میں شامل کر دیے جاتے ہیں کہ ان سے استفادہ تو درکنار، ایک نظر دیکھنا بھی گراں گزرتا ہے۔ مناسب ترتیب اور اہم و کم اہم کی تمیز بھی اس سلسلے میں ملحوظ رہنی چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ ضمائم کی نام دہی اور فہرست میں ان کے اندراج کو یقینی بنانا بھی اہم ہے۔

فہرست سازی اور ترتیبِ مواد کے حوالے سے بھی مدون کی توجہ ضروری ہے۔ فہرست بناتے وقت پہلے مقدمہ پھر متن اور اس کے بعد بتدریج حواشی، تعلیقات، فرہنگ، اشاریہ اور ضمائم کا اندراج ہونا چاہیے۔ مواد کی ترتیب اس فہرست کے مطابق کئی بار ملاحظہ کر لینی چاہیے۔ عجلت اور بے توجہی اچھے سے اچھے کام کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اس لیے مدون پر لازم ہے کہ وہ اپنے کام کے اس آخری مرحلے کو بھی توجہ سے انجام دے تا کہ ایک مفید تحقیق ایک موثر انداز میں قارئین تک پہنچے۔

حواشی / حوالہ جات

۱۔ متن کی تعریف میں کسی قدر الجھن ہے۔ یہ الجھن بعض عالموں کو بھی مخمصے میں ڈالتی رہی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر خلیق انجم متن کے باب میں لکھتے ہیں: ”میں نے اپنی کتاب ’متنی تنقید‘ میں متن کی تعریف کرتے ہوئے ہوئے لکھا تھا: ’جس مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریر کو متنی نقاد مرتب کرنا چاہتا ہے اسے متن کہتے ہیں‘ متن کی یہ تعریف درست نہیں ہے۔ متن کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کہ متنی نقاد جس تحریر کو مرتب کرنا چاہتا ہے وہ متن ہے، اس کا مطلب ہے جس تحریر کو متنی نقاد تنقیدی متن تیار کرنے کے لیے منتخب نہیں کرتا وہ متن نہیں۔ حالانکہ متنی نقاد کسی تحریر کو مرتب کرنے کے لیے منتخب کرے یا نہ کرے، ہر قدیم یا جدید منظوم یا منثور تحریر بہر حال متن ہوگی۔“ (متنی تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹) اس توضیح کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں تذبذب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متن کی مزید وضاحت کے لیے انھوں نے مولوی عبد الحق کی مرتبہ اسٹنڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری، دی کانسائیز اوکسفرڈ ڈکشنری اور ایس ایم کاترے کے حوالے پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد متن کے بارے میں چھ نکاتی بیان ہے جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر خلیق انجم ہی کا تتبع کیا ہے۔ یعنی: ”ہم متن اس تحریر کو کہہ سکتے ہیں جسے کوئی محقق ترتیب دینا چاہتا ہے۔“ (تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۹۷) کچھ اسی طرح کی مخلوط صورت ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے ہاں بھی ہے۔ لکھتے ہیں: ”متن Text کسی ایسی عبارت ’تحریر‘ یا نقوش تحریر کو کہتے ہیں جن کی قرأت یا معنوی تفہیم ممکن ہو۔“ (اصول تحقیق و ترتیب متن، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳)

تو گویا ایسے نقوش تحریر جن کی قرأت یا معنوی تفہیم ممکن نہ ہو، وہ متن نہیں؟ ۔۔ یقیناً ہے۔ پس متن کی بہتر تعریف یہی ہے کہ متن کسی عبارت یا نقوش تحریر کو کہتے ہیں۔ اور

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ جملہ بھی مناسب ہے کہ ’ہر قدیم یا جدید منظوم یا منثور تحریر بہر حال متن ہو گی‘۔

۲۔ محمد حسن، پروفیسر، ادبی تحقیق کے بعض مسائل، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸، ص ۱۲۹

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۵۳

۴۔ ڈاکٹر عطش درانی کے خیال میں: ”کسی متن کی تدوین، تحقیق کے ڈسپلن کا حصہ نہیں ٹھہرتی، اس لیے اسے کامل تحقیق قرار دینا مشکل ہو گا، کیونکہ یہ کام کسی مستقل ڈیزائین کی بنا پر انجام نہیں پاتا۔ اس کے باوجود بڑے بڑے تحقیقی متن وجود میں آئے۔ (جدید رسمیات تحقیق، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۸۹) اس نقطۂ نظر کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس ’منفرد‘ کتاب میں دو باب تدوین کی نذر کیے ہیں۔ معلومات پر دسترس ملاحظہ ہو؛ لکھتے ہیں: ”تدوین متن ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ اس پر دو کتابیں اور ایک مجموعہ مضامین ملتا ہے۔“ (ص ۲۹۳) چھپن صفحات پر مشتمل ان دو ابواب میں تدوین و تصحیح متن پر قبل ازیں کی تحریروں کو عجب کاریگری کے ساتھ یکجا دیکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ’متنی تنقید‘ میں ’اردو کی رسمِ خط کی دشواریاں‘ کے تحت ۱۹ صفحات پر مشتمل تفاصیل دی ہیں۔ (دیکھیے ص ۷۹ تا ۹۸) پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کتاب میں اس بابت لکھا ہے: ”تحقیق متن کے لحاظ سے فارسی عربی رسم خط میں لکھے جانے متون کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہو گیا ہے۔ اس کی وجوہ یہ ہیں: ۔۔۔“ تیرہ وجوہ بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق رسم خط کی پیچیدگی سے ہے۔ دیکھیے: (تصحیح و تحقیق متن، ادارۂ یادگار غالب کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸ تا ۲۱)۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند نے بھی اردو رسم الخط کے حوالے گیارہ کے قریب دقتوں کو نشان زد کیا ہے۔ (تحقیق کا فن، ص ۴۰۸ تا ۴۱۱) ڈاکٹر عطش درانی صاحب نے گیان چند کی بیان کردہ گیارہ دقتوں کو مع سیاق و سباق (چند لفظی تصرف کے ساتھ) بیان کیا ہے۔ (دیکھیے ص ۳۰۳ تا ۳۰۶)

۶۔ اساسی نسخے کے تعین کی بابت اصول تدوین کی بعض کتب میں سرسری اندراجات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر نذیر احمد کی کتب میں یہ صورتحال نمایاں ہے۔ البتہ ڈاکٹر

تنویر احمد علوی نے قدرے تفصیل سے قلمی و مطبوعہ متون کی اساسی نسخے کے حوالے سے درجہ بندی کر کے امثلہ کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ دیکھیے: (اصول تحقیق و ترتیب متن، ص ۳۹ تا ۵۲)

۷۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی رائے ملاحظہ ہو: ”اگر ہم یہ طے کر لیں کہ تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے ہوئے متن کی املا وہی رکھی جائے گی جس املا میں مصنف نے متن لکھا تھا تو کچھ متون پر تو ہم اس قاعدے کا اطلاق کر سکتے ہیں لیکن بیشتر پر نہیں۔ کیونکہ ہر زبان کی طرح اردو املا بھی صدیوں تک ارتقا کی منزلوں سے گزری ہے۔ ہم شمالی ہند کے اٹھارہویں صدی تک کے متن تو پڑھ سکتے ہیں لیکن اس سے قبل اور خاص طور سے دکنی اردو کے متون لکھنے میں الفاظ کی ایسی املا کی گئی ہے کہ ہم متن آسانی سے نہیں پڑھ سکتے اور بعض اوقات تو اردو املا کی ابتدائی ارتقائی منزلوں سے واقف ہوئے بغیر بالکل نہیں پڑھ سکتے۔ متنی نقاد تو کسی نہ کسی طرح یہ متن پڑھ لے گا، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تنقیدی ایڈیشن میں کس املا کا استعمال کرے، اگر وہ املا استعمال کرے جو مصنف کی ہے تو ہمارے عہد کے نوے فیصد اسکالر اور سو فیصد طلبہ یہ متن نہیں پڑھ سکیں گے اس لیے ہمیں تنقیدی ایڈیشن میں اپنے عہد کی املا استعمال کرنی چاہیے۔“ (متنی تنقید، ص ۲۷۰) اور پروفیسر نذیر احمد کے نزدیک: ”۔۔۔ مجھے وہ طریقِ کار زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اتنی قدیم اور نادر کتاب کے قدیم مخطوطے کا عکسی ایڈیشن ہو اور اس کے ساتھ اس کا متن جدید املا میں تیار کر کے دونوں ساتھ ساتھ شائع ہوں۔۔۔“ (تصحیح و تحقیق متن، ص ۴۹)

قدیم متون میں علامات ورموزِ تحریر کی قرأت

قدیم متون کی تدوین میں رسم الخط کے حوالے سے جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں حروف کی کامل اور اصلی صورتوں کی تفہیم کے ساتھ ساتھ حروف، اعداد، اوزان، القابات اور اشارات کی اختصاری اشکال اور دیگر رموزِ تحریر کی شناخت کے مسائل بھی نمایاں ہیں۔ زبان اور اس کی تحریری علامتوں کے ارتقاء وتغیر پر نظر رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ زبانیں اپنے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظرات میں کمال وزوال سے آشنا ہوتی رہتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی عہد میں زبان کے تحریری معیارات اور متفق علیہ پیمانے آئندہ ادوار میں بھی رائج، قابل تقلید اور مستند ومسلم رہیں۔ زبانوں میں لفظ ومعنی اور صورت و ساخت کے استناد کا معاملہ متعلقہ ومتعینہ عہد کے حوالے ہی سے اہم ہے۔ لسانیاتی نقطہ نظر سے رسم الخط کوئی طے شدہ اور جامد دستور العمل نہیں بلکہ تغیر پذیر اور حرکی خصوصیات رکھنے والا نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسم الخط میں نشانات و علامات اور رموز کی قدامت و جدت، بنیاد وتوسیع اور تشکیل ومعیار کی بحث ایک لازمی وجاری عمل ہے۔ قدیم متون کی تدوین میں حقیقی متن ومعانی تک رسائی کے لیے یہ بحث بنیادی حیثیت کر لیتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ متعلقہ متن کی تبدیل شدہ یا متروک علامتوں، اختصارات اور رموز کی قرأت وتفہیم ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے۔ زیر نظر مقالے میں اردو کے حوالے سے اس مسئلے کی مختلف صورتوں پر بحث کی گئی ہے۔

یہ ایک تاریخی ولسانی حقیقت ہے کہ اردو کی بلوغت وپختگی کے مراحل عربی وفارسی

کے زیرسایہ طے ہوئے۔ گفتگو کی زبان سے اعلیٰ علمی، ادبی، اور سیاسی، سماجی اظہارات کے قابل بننے کے دورانیے میں عربی اور فارسی زبانیں ہر حوالے سے اردو کے لیے مثال بنی رہیں۔ عربی وفارسی سے اظہار وابلاغ اور بیان کے وسیلوں میں مدد لینے کے ساتھ وسائل تحریر بھی مستعار لیے گئے۔ اردو کی تحریر وکتابت کے ابتدائی دور میں ان وسائل تحریر ہی کی بنیاد پر متون خلق ہوئے۔ تدوینی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان متون کو دو واضح زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ۱۔ قلمی / کتابت شدہ متون، ۲۔ مطبوعہ متون۔ ہر دو میں تحریر کی قرأت وتفہیم میں جو عمومی مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں پیش ہے:

۱۔ اردو کے قدیم متون کی قرأت میں رسم الخط کے حوالے سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ حروف کی تشکیلی صورتوں سے متعلق ہے۔ (ا) عربی اور فارسی سے من وعن مستعار لیے گئے حروف کی قرأت تو دقت طلب نہیں ہوتی لیکن مقامی طور پر بنائے گئے حروف ارتقاء کی مختلف منزلوں سے گزرتے رہے ہیں۔ کس زمانے میں ان کی کیا شکل تھی، یہ جانے بغیر قرأت ممکن نہیں ہوتی۔

۲۔ اردو کے مختلف تحریری خط (فونٹ سٹائلز) میں حروف کی شکل اور دوسرے حروف سے جڑت کا معیار بدل جاتا ہے۔ اردو کے قدیم متون کی تدوین میں خط کا تعین اور اس کی خصوصیات سے آگاہی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بعض معروف خطوط مثلاً نسخ اور نستعلیق (جو فی زمانہ بھی رائج ہیں) کی پہچان میں تو زیادہ مشکل پیش نہیں آتی لیکن خط شکستہ، دیوانی، ثلث اور دیگر الحاقی خطوط میں لکھے گئے متون کی قرأت متعلقہ خط سے شناسائی کے بغیر مجہول ولایعنی ہو جاتی ہے۔

۳۔ قلمی / کتابت شدہ متون میں کاتب کے خطی امتیازات کو سمجھنا اور حروف کی لکھت و جڑت میں اس کے شخصی عمل دخل اور مزاج کو مدنظر رکھنا ایک اہم معاملہ ہے۔ ساتھ

حرفی اندراج مسلسل استعمال کی بدولت عجم میں رفتہ رفتہ ایک نئی اختصاری صورت اختیار کر گیا۔ اس اختصاری رمزیے کی پڑھت حسابی منشیوں اور متعلقہ دفتری اہلکاروں کے ساتھ عام عوام کے لیے بھی ایک زمانے میں مانوس تھی لیکن فی زمانہ متروک ہو جانے کی وجہ وقت طلب ہے۔ مثلاً عربی عدد اربعہ کا اختصاری رمزیہ (للعہ /)، ثمانیہ کا (معے /)، تسعہ کا (لعہ /) وغیرہ۔ اسی طرح دہائی، سینکڑہ اور ہزار کے لیے اختصاری رمزے یا تحریری علامتیں متعین تھیں جو اب کمپوز کاری میں نہیں آتیں اور عام کتابت میں بھی مستعمل نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حساب کتاب میں پیسہ و آنہ کے رموز بھی جداگانہ ہیں۔ (۳) قدیم متون میں اندراجات کی پڑھت آج کے محقق و مدون کے لیے ایک بڑا اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ مصیبت یہ کہ قلمی لکھت میں ان علامات کی اشکال کاتب کے تصرف کا بھی شکار ہوتی ہیں۔ نتیجتاً معیاری اور تحریفی صورت میں تال میل کا مسئلہ مشکل پر مشکل بن جاتا ہے۔

۳۔ اوزان کے اندراج کا طریقہ بھی قدیم متون میں عربی کے زیر اثر ہے اور رقوم کی طرح اس ضمن میں بھی اختصارات متعین تھے۔ چھٹانک، پاؤ، سیر اور دیگر متعلقہ اوزان کی قرأت طے شدہ اختصارات سے شناسائی کے بغیر آج کے محقق کے لیے ممکن نہیں۔ فی زمانہ یہ رمزیے کمپوز کاری میں نہیں آتے اس لیے مشینی کتابت میں ان کی مثالیں بھی نہیں دی جاسکتیں۔ (۴) بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان علامات میں سے بعض میں مماثلت ہے۔ یہ مماثلت قلمی متون میں التباس و اشتباہ کا باعث بنتی ہے اور یقینی طور پر قرأت کو مجہول بنا دیتی ہے۔

۴۔ قدیم متون میں بعض اشارات و مخففات کی قرأت بھی ایک اہم نکتہ ہے۔ ان مخففات میں سے کچھ ایسے ہیں جو قدیم میں رائج اور معیاری تھے تاہم بعض متون میں تحریر کی نوعیت کے مطابق اختصارات کا تعین ملتا ہے۔ اول الذکر کی قرأت متعلقہ علامات سے شناسائی کے بعد ممکن ہو جاتی ہے تاہم ثانی الذکر میں متن کا سیاق و سباق اور خود مصنف یا کاتب کی تصریحات قرأت میں معاون بنتی ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو پھر قیاس کے بغیر

چارہ نہیں ہوتا۔ معروف اشارات و مخففات میں ''قف'' کی علامت وقفہ یا ٹھہراؤ کے لیے، ''ف'' کی علامت فائدہ یا نوٹ کے لیے، ''رک'' کی علامت ماخذ کے حوالے کے لیے، ''ع'' کی علامت عشرِ متن کے لیے، ''کذا'' کی علامت کذا فی الاصل کے لیے، ''قب'' کی علامت متعلق حوالہ کے لیے ''ن'' کی علامت نسخہ اور ''ع'' کی علامت مصرع کے لیے مستعمل ملتی ہے۔ اسی طرح بعض دیگر اختصارات بھی اہم ہیں جیسے ''ق م'' زمانہ قبل مسیح کے لیے، ''م'' متوفی کے لیے، ''پ'' پیدائش کے لیے ''مص'' مصنف کے لیے، ''تعہ'' تعالیٰ کے لیے، ''بسمہ'' باسمہ یا بسم اللہ کے لیے، ''حمدلہ'' الحمد للہ کے لیے، ''الخ'' الی آخر کے لیے، ''ح'' حینئذ (اس وقت، اب تک) کے لیے، ''وصہ'' وصول شد کے لیے وغیرہ۔

۵۔ قدیم متون میں رموزِ اوقاف کی قرأت سے زیادہ ان کے تعین کا مسئلہ اہم ہے۔ بہت سے قدیم متون میں یہ روش عام ہے کہ جملوں کے جملے بلا علاماتِ اوقاف کے درج ہیں۔ کس جگہ کس علامت کا محل ہے۔۔ یہ فیصلہ کرنا مدون کے لیے ایک امتحان بن جاتا ہے۔ وقفہ، سکتہ، رابطہ، تفصیلیہ، قوسین، واوین اور دیگر اوقاف کی تحریری علامتیں (جزوی ترمیم کے ساتھ) آج بھی وہی ہیں جو قدیم اردو متون میں ملتی ہیں تاہم ان کے استعمال میں کسی خاص التزام کے نہ ہونے اور بے احتیاطی و عدم توجہی کی وجہ سے قرأت مختلف و متضاد رستوں پر چل نکلتی ہے۔

۶۔ قدیم متون میں اعراب کا استعمال بہت کم ملتا ہے۔ حتٰی کہ خالص عربی عبارات بھی اعراب سے تہی ہیں۔ اردو میں اعرابی نظام کا معاملہ آج بھی ایک حل طلب مسئلہ ہے اور جدید متون کی قرأت میں بھی علتی آوازوں کے معروف یا مجہول ہونے کا فیصلہ قیاسی ہی ہوتا ہے۔ (۵) قدیم متون میں بھی تحریر کے سیاق و سباق کے مطابق ممکنہ اعرابی صورت کا تعین مدون کے لیے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور اس حوالے سے قرأت میں معمولی سی لغزش معنی کو کچھ کا

کچھ کر دیتی ہے۔

ان چیدہ مسائل کے ساتھ صفحات کی ترتیب کے لیے درج اشارے، حاشیے کے لیے بین المتن رموز، عنوانات کے لیے اختصاصی طریقے، متن کے ایک حصے کو دوسرے سے جدا و ممتاز کرنے کے آرائشی و غیر آرائشی نقوش و نشانات وغیرہ بھی قدیم متون کی قرأت میں غور طلب ہوتے ہیں۔ ان رموزِ تحریر سے شناسائی اور معیاری و تصریفی صورتوں سے واقفیت کے بغیر قدیم متون کی قرأت و تدوین کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فی زمانہ ان رموز کی تفہیم و آگہی اردو تحقیق و تدوین کے اعلیٰ تدریسی مراحل میں یقینی بنائی جائے۔ تدریسِ اصولِ تدوین میں رسم الخط کی قدیم صورتوں اور پیچیدگیوں کی بحث میں ان رموز کے حوالے سے ایک بحث کا اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مشینی کتابت میں ان علامات کی لکھت کا اہتمام بھی اہم ہے۔ صرف اسی صورت میں جدید محققین و مدونین کے ہاں اردو کے کلاسیکی علمی و ادبی سرمائے کی بہتر قرأت کی توقع، خواب سے حقیقت کا روپ دھار سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ اردو رسم الخط میں بنیادی تصویر نقطوں اور حرکت کی علامتوں سے وابستہ ہے۔ نقطوں کی کمی بیشی یا متعین سے زیادہ ملاپ یا متعینہ جگہ سے دوری و قربت قرأت میں ابہام و پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح حرکات کی عدم لکھت یا مبہم و غیر متعینہ لکھت اصل تصویری شناخت کو متاثر کر دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو رسم الخط میں بنیادی تصویری علامتوں کا مختلف مواقع پر مختلف اتصال و ملاپ ہے۔ یہ اتصال اگر صحت و درستی کے ساتھ نہ ہو تو مرکب تصویر ابہام کا باعث بنتی ہے۔ اردو کے اکثر تحریری تصویریے مہین شوشوں اور خاص گولائیوں کے تحت اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اگر شوشوں کی پیشکش درست طور پر نہ ہو یا مطلوبہ گولائیوں اور طوالت و اختصار کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو تو تحریر کی قرأت میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قدیم قلمی متون کی قرأت میں رسم الخط کے حوالے سے یہ پیچیدگیاں عام ہیں۔ خاص طور خطی اختصار والے متون میں یہ مسائل کہیں زیادہ ہیں۔

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن، از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۷ء/ سنگت پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔ متنی تنقید، از ڈاکٹر خلیق انجم، خرام پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۶۷ء/ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء (نیا ایڈیشن)۔ اردو میں اصولِ تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش (دو جلدیں) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، از رشید حسن خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، انڈیا، ۱۹۷۸ء۔ مبادیاتِ تحقیق از عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، انڈیا، ۱۹۶۸ء۔ اردو تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۰۳ء۔ ادبی تحقیق کے اصول، از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۲ء۔ تحقیق کا فن، از ڈاکٹر گیان چند، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

۳۔ عربی ارقام کے حوالے سے پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں: بنی بویہ کی حکمرانی کے دور

(۱۰۵۵-۹۳۲ء) میں دیوان استیفاء (وزارت خزانہ) کے کتاب (اہل کار) اور حساب (حساب دان) مالی رقومات کو الفاظ میں لکھتے تھے۔ کثرت استعمال سے ان الفاظ نے رمزیہ شکلیں اختیار کر لیں۔ جن کو دفتر کے اہل کار تو بخوبی پڑھ لیتے تھے لیکن عوام ان کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اہل دفتر کو یہ طریقہ پسند آیا۔ انھوں نے اس میں باقاعدگی پیدا کر لی۔ ان مرموز شکلوں سے مکمل گنتی لکھی جاتی تھی۔ ان کو عربی ارقام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آل بویہ اور سلاجقہ کے دور حکومت میں یہ طریقۂ حساب ایران اور عرب میں رائج ہو گیا۔ آل غزنیہ کی حکومت کے دور میں یہ طریقہ ہندوستان میں بھی رائج ہو گیا۔ اسلامی دور میں تمام حسابات عربی ارقام ہی میں لکھے جاتے تھے۔ آج سے نصف صدی قبل تک خانگی حسابات بھی اسی طریقے سے لکھے جاتے تھے۔ انگریزوں کی حکومت کے بعد یہ طریقۂ حساب متروک ہوتا چلا گیا۔ (اردو رسم الخط، ص ۵۱-۵۰) رقوم کے اندراج کے لیے مروج علامتیں فی زمانہ مشینی کتابت میں نہیں آتیں۔ ضروری ہے کہ ان کی پڑھت و تفہیم کا مناسب انتظام ہو۔ کتاب مذکور میں اس حوالے سے کوشش کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: اردو رسم الخط، از پروفیسر سید محمد سلیم، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء

۴۔ نمونوں اور امثلہ کے لیے ملاحظہ ہو: اردو رسم الخط، حولہ بالا، صفحہ ۵۳ و ۵۴

۵۔ اردو میں مصوتی آوازوں کے لیے صرف ایک حرف ''الف'' ہے۔ باقی تمام تر علتی ادائیگیاں اعراب کے رہینِ منت ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں: ''اردو میں مصوتوں (حروف علت و حرکات) کے لیے بہت کم حروف ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہی حرف ہے یعنی الف۔ اس لیے مصوتوں کے تلفظ کو صحیح طور پر املا کی گرفت میں لانے کے لیے اعراب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ (املا نامہ، ص ۹۸) اس صورت حال کے پیش نظر ہندوستان و پاکستان میں اردو کے مستند اداروں نے چند علامات کے استعمال پر اتفاق کیا ہے اور اب یہ علامات اردو متون میں بتدریج رائج ہو رہی ہیں تاہم کلی طور پر علتی آوازوں کی ادائیگی تحریر میں اب بھی شفاف و سہل نہیں۔ اعراب کے حوالے سے مجوزہ سفارشات کے لیے دیکھیے: املا نامہ از گوپی چند نارنگ، (سفارشات املا کمیٹی، ترقی اردو بورڈ، بھارت)، سرحد اکیڈمی، ایبٹ آباد، ۱۹۹۲ء/ اعجاز راہی، سفارشات املا و رموز اوقاف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء / اُردو املاء رموز اوقاف مرتبہ، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء

تحقیق کی ایک صورت تو وہ ہے جہاں محقق اپنی ذاتی دلچسپی یا کسی ادارے کے لیے تحقیقی کام کرتا ہے۔ اب یہ صورت بہت محدود ہوگئی ہے کہ تحقیق وہ فن ہے جس میں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ مالی وسائل بھی اہم ہیں، جو اکثر صورتوں میں میسر نہیں ہوتے۔ اس لیے انفرادی تحقیق کی تعداد ہمیشہ کی طرح آج بھی محدود ہے۔ البتہ ملازمتی ضرورتوں کے تحت اب جامعات میں تحقیقی مقالے لکھنے کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے معیار کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ پہلے یہ کام شوق سے ہوتا تھا، اب تنخواہ میں اضافے کے ہونے لگا ہے۔ کوئی اہل ہے یا نہیں الاؤنس کے لالچ میں ایم فل، پی ایچ ڈی کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں لیکن بڑھتی ہوئی تعداد معیار کو ضرور متاثر کر رہی ہے۔

معیار بندی کے اس معاملے میں جہاں اساتذہ ذمے دار ہیں وہاں اچھی اور معیاری کتابوں کی عدم دستیابی بھی وجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض تحقیقی طریقہ ہائے کار پر اختلافات بھی ہیں، خصوصاً حوالہ جات، اشاریہ سازی اور مقالے کی پیشکش کے حوالے سے متضاد آرا کی موجودگی کی وجہ سے جامعاتی محقق کو کئی الجھنوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کی یہ کتاب ”قواعدِ تحقیق و تدوین“ اگرچہ ضخامت کے حوالے سے چھوٹی لیکن مواد کی صحت کے حوالے سے بڑی کتاب ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے اردو ادبی تحقیق کے حوالے سے بنیادی موضوع کا تعین و تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ دوسرے حصے کے پانچ مضامین تحقیقی مقالے کی بنیادی شناخت، خاکہ سازی، عنوان سازی، تحقیقی مقالے کی زبان و اسلوب اور مآخذ کے اندراج سے متعلق ہیں۔ کسی بھی جامعاتی تحقیقی مقالے کے یہ وہ بنیادی مراحل ہیں جن کی صحت کا خیال رکھے بغیر، موضوع کتنا بھی اہم اور منفرد ہو، اچھا مقالہ تحریر نہیں ہوسکتا۔ تیسرا حصہ متن اور تدوینِ متن سے متعلق ہے جو اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق انجم کی اس کتاب کی خوبی اس کا سادہ اور دلچسپ اسلوب اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اپنے تجربے اور غور فکر سے کئی اہم امور پر دوٹوک اظہار کیا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں واضح ہیں۔ ادق تحقیقی اصطلاحوں کے بجائے انھوں نے سادہ اور صاف انداز اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب عالموں کے لیے نہیں طالبعلموں کے لیے ہے اور بہت ہی مفید۔ جامعاتی مقالہ لکھنے والے ہر سکالر کے لیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید اور ضروری ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد